Cat bgph

مخصوص کا نمبر مصنف عاصی (منشی گنیا...

صفحہ ؍

عنوان ؍

ترقی ؍

فرقہ ؍

اردو شاعری - مجموعہ کلام

سلسلۂ کائستھ اُردو سبھا دہلی نمبر ۲

اوم

کلامِ عاصیؔ

یعنی

غالبؔ اور ذوقؔ کے ہمعصر اور شاہ نصیرؔ کے مایۂ ناز شاگرد

منشی گھنشیام لال عاصیؔ دہلوی

کا

مجموعۂ کلام

جو اُس وقت کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے

مرتّبہ
من موہن لال ماتھرؔ دہلوی ایم، اے۔
پروفیسر فارسی و اُردو ہندو سبھا کالج امرتسر

از طرف
کائستھ اُردو سبھا دہلی

دیال پرنٹنگ پریس دہلی

عرضِ حال

کائستھ اردو سبھا دہلی اس لئے قائم کی گئی ہے، کہ اُن قابل مصنفوں اور شاعروں کے کلام کی اشاعت کرے، جنہوں نے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اور جن کا کلام ابھی تک اشاعت کا محتاج ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف اُن لایق ہستیوں کی یاد ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں تازہ رہیگی۔ بلکہ اُردو زبان کا سرمایہ بھی بڑھ جائے گا۔

کائستھ اُردو سبھا کی ممبری کا چندہ صرف ۴؍ ماہوار یعنی تین روپے سالانہ ہے۔ ہر ممبر کو ہر اشاعت کی ایک جلد مفت بھیجی جائیگی۔

چندہ سرپرستی کم از کم پانچ روپے شروع سال کے لئے ہے۔ آیندہ تین روپے سالانہ۔ لائف ممبری (تا زیست) پچاس روپے۔

جن اصحاب کے پاس اپنا یا بزرگوں کا عمدہ یا غیر شایع شدہ کلام موجود ہو، وہ دفتر "کائستھ اُردو سبھا" دہلی سے، خط و کتابت کریں۔

من موہن ایم اے
(سکرٹری کائستھ اُردو سبھا)
پروفیسر فارسی و اُردو ہندو سبھا کالج امرتسر

فہرستِ مضامین

عاصی کے حالاتِ زندگی

منشی گھنشیام لال المتخلص بہ عاصی قوم کے کائستھ ماتھر، دہلی کے رہنے والے تھے۔ آپ کے بزرگ عہدِ سلطنتِ مغلیہ میں جلیل القدر عہدوں پر ممتاز رہے۔ آپ کے والد بزرگوار رائے چُنی لال[1] شاہِ عالم اور اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں دیوانی کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ اور آپ کے برادر زادہ کلاں منشی مکند لال بہادر شاہ کے میر منشی تھے۔

عاصی غالباً ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ کیونکہ اُنہوں نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں غدر کے بعد ۱۸۶۵ء میں وفات پائی۔ معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانہ سلطنت میں حضرت عاصی مرزا بابر خلف اکبر شاہ کی ملازمت میں تھے۔ اپنے زمانہ کے ہر فن اور ہنر میں اُستاد مانے جاتے تھے خصوصاً پیرالی، خوشنویسی اور علم موسیقی میں کمال کا درجہ رکھتے تھے۔ شاعری میں شاہ نصیر کے ایک مایۂ ناز شاگرد تھے۔ چونکہ شیخ محمد ابراہیم ذوق بھی ابتدائً شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اس لئے شروع شروع میں عاصی اور ذوق میں رابطۂ اتحاد قائم تھا۔ بعد میں ذوق کے تعلقات جب اُستاد سے کشیدہ ہو گئے۔ تو عاصی اور ذوق میں بھی ضرور کشیدگی ہو گئی ہو گی۔

عاصی کے خلف الصدق منشی بنسی لال علاقہ انگریزی میں تحصیلدار تھے۔ اور ۱۸۹۰ء میں بمقام سمرالہ ضلع لدھیانہ پنشن یاب ہوئے۔ اس وقت اُن کی عمر ۷۵

[1] بعض تذکروں میں اُن کا نام منشی سول چند لکھا ہے۔ اور بعض بزرگ منشی گردھاری لال بتاتے ہیں۔ غالباً یہ نام اُن کے ننھیال وغیرہ کے ہوں گے۔ اصلی نام چُنی لال کلامِ عاصی کے قلمی نسخے کے آخر میں درج ہے، اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سال تھی۔ اُنہوں نے پُرانے صندوق میں سے اوراقِ پریشان کو فراہم کر کے اور ترتیب دے کر فروری ۱۸۹۲ء سے مارچ ۱۸۹۳ء تک کلامِ عاصی کو ایک جگہ مرتب کیا۔ اور یہ قلمی دیوان منشی بنسی لال کے بڑے صاحبزادہ منشی بنس گوپال صاحب شاعر بی اے، ایل ایل بی کے پاس بزرگوں کے تبرک کے طور پر محفوظ ہے۔ اسی قلمی نسخے میں عاصی کے حالاتِ زندگی اور ردیف تیلیاں والے معرکہ کے مشاعرہ کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ درج ہے، جس کو محض مزید معلومات اور تحقیق کی غرض سے درج کر دیا گیا ہے۔

عاصی کو مختلف اصنافِ شاعری میں پوری دسترس حاصل تھی۔ غزل گوئی کے علاوہ قصیدہ، رباعی، مخمس، مسدس وغیرہ پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ مادۂ تاریخ نکالنے، اور صنائع بدائع کے استعمال میں ماہر تھے۔ اس زمانے کے دہلی کے مشاہیر پر جن میں چند انگریز بھی شامل تھے، نظمیں لکھی ہیں۔ راجہ بنے سنگھ والیٔ الور کی شان میں بھی ایک قصیدہ کہا ہے۔ راجہ اجیت سنگھ برادر مہاراجہ پٹیالہ جو دہلی میں قیام کرتے تھے، عاصی کے معتقد تھے۔ کہتے ہیں، کہ انہوں نے ایک دن یہ مصرع پیش کیا۔ اور گرہ چاہی۔ ؎

آہنیں بنوائے پہلے مرغِ آتشگر چونچ

عاصی نے فوراً یہ مصرع چسپاں کر دیا۔ ؎

اے ہما تب استخواں پر دل جلوں کے جیر چونچ

اسی طرح پر پوری غزل مرتب ہو گئی۔ جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔ ؎

آشیاں باندھے نہ کیوں شاخِ محبت پر بلند
ہے بئے کے گھر میں ساری صاحبِ تدبیر چونچ

عاصی کی زندگی زیادہ تر دہلی ہی میں گذری۔ مراد آباد میں بھی پہنچے تھے۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

ہم نے آتے ہی مراد آباد میں　　دل دیا عاصی پری رویوں کے ہاتھ

لیکن زیادہ مدّت تک وہاں رہے نہیں۔

عاصی آزاد طبع اور صاف گو تھے۔ مزاج تیز پایا تھا۔ بے دھڑک کھری

ٹھری سنادیا کرتے تھے۔ ہجو بھی خوب کہتے تھے۔

اَولاد:۔ عاصی کے صرف ایک فرزند تھے۔ جن کا نام بنسی لال تھا۔ بنسی لال کو باقاعدہ شاعری کرنے کی فرصت بوجہ مشغولی ملازمت سرکار انگریزی نہ ملی۔ لیکن طبیعت شاعرانہ پائی تھی، اور پنشن لینے کے بعد دہلی میں قیام کرنے کے دوران میں کچھ عمدہ اشعار اور قطعات لکھے۔ تاریخیں بھی خوب نکالی ہیں۔ جن کو علیحدہ ضمیمہ کے طور پر شایع کیا جا رہا ہے۔ بنسی لال جی نے ۱۹۰۷ء میں بعمر ۷۳ سال وفات پائی۔

بنسی لال جی کا اُستاد ذوق کے پاس شروع میں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ اور ذوق اُن سے اپنے بچوں کی طرح محبت رکھتے تھے۔

منشی بنسی لال کے تین فرزند ہیں۔ منشی بنس گوپال المتخلص بہ شاعر۔ منشی موہن لال۔ اور منشی نول کشور۔

شاعری منشی بنس گوپال بی اے ایل ایل بی ہی کے ورثہ میں آئی ہے۔ آپ ایک پنشن یافتہ بزرگ ہیں۔ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ عمر اس وقت ۷۱ سال کی ہے۔ لیکن خدا کے فضل سے طبیعت اب بھی جوان اور شگفتہ ہے۔ نہایت وضعدار شخص ہیں۔ خاص کر آپ کی آصف جاہی ڈاڑھی اور آصف جاہی ٹوپی قابل ذکر ہیں۔ پنشن لینے کے بعد شاعری کی فرصت ملی۔ زود گوئی اور پُرگوئی میں ماہر ہیں۔ اپنے دیوان کو خود ہی ترتیب دے رہے ہیں۔ تخیل بلند اور ذخیرہ الفاظ وسیع ہے۔ افسوس! کہ آپ کے دو فرزند رشید جواں مرگ ہو گئے۔ اب آپ کی اُمیدیں اپنے بڑے پوتے مسٹر ہری گوپال کے ساتھ وابستہ ہیں، جو ایک ہونہار کالجیئٹ ہیں۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ اور شفیق بابا کا سایۂ عاطفت ان کے سر پر دیر تک قایم رکھے۔

کلامِ عاصی منشی بنس گوپال شاعر ہی کی عنایت بے نہایت سے طبع ہو سکا۔ آپ نے ازراہِ کرم ہماری درخواست قبول کر کے دیوان عاصی کا قلمی نسخہ جس کی صرف ایک ہی کاپی موجود ہے، اور وہ بھی آپ ہی کے پاس، عاریتاً عنایت فرمایا۔ ہم آپ کے تہِ دل سے ممنون ہیں۔

عاصی کے دو نواسے منشی بہاری لال مشتاقؔ اور منشی گوری شنکر قیصرؔ دہلوی بھی بڑے پایہ کے شاعر ہوئے ہیں۔ قیصرؔ کا ایک شعر ہے۔

کیوں ہوں نہ قیصرؔ آپ سخن سنج سخنور
مشتاقؔ کے بھائی ہیں تو عاصیؔ کے نواسے

کلام پر رائے۔ منشی گھنشیام لال عاصیؔ ہر فن و ہنر میں ماہر تھے۔ ان کی طبیعت میں شاعری تو قدرت سے ودیعت تھی ہی۔ جملہ علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھنے کی وجہ سے ذخیرہ معلومات نہایت وسیع ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں ہر علم کی اصطلاحات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور ایک معمولی استعداد کے شخص کے لئے ان کے کلام کو سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ گنجفہ، شطرنج، چوسر، نجوم، موسیقی، پیراکی، جغرافیہ، تاریخ، ریاضی، فلسفہ، مطالعہ قدرت وغیرہ سب میں طاق تھے۔ اسی وجہ سے مشکل ردیفوں و قافیوں میں ایسے اور اتنے شعر لکھ جاتے ہیں، کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

چونکہ خاص دہلی کے رہنے والے تھے، اور تمام عمر کٹی بھی دہلی ہی میں۔ زبان پر پوری دسترس حاصل تھی۔ اُن کے کلام کو غور سے پڑھنے اور سمجھنے سے معلوم ہوگا، کہ یہ مجموعہ اس وقت کی اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہے۔

یہ امر باعث حیرت ہے، کہ ایسے عالم و فاضل اور دقیق و فائق شاعر کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہی نہیں۔

سُنا ہے، کہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے عاصی کا کلام اور ان کے حالات زندگی ان کے فرزند رشید منشی بنسی لال سے مانگ کر لئے، اور ارادہ ظاہر کیا۔ کہ وہ ان سب کا ذکر مفصل طور پر "آبِ حیات" میں ضرور کر دیں گے۔ لیکن نتیجہ معلوم۔

"تیلیاں" والی ردیف کے معرکہ آرا مشاعرے کے ذکر میں نہ صرف اصل روئداد کو حذف کر دیا ہے۔ بلکہ عاصی کے مندرجہ ذیل شعر کو بھی شاہ نصیرؔ کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیرؔ کے نام سے لکھ دیا ہے۔

گرچہ[1] قندیل سخن کو ہنڈ لیا، تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

بعد ازاں شرما شرمی اسی موقع پر حواشی میں لکھتے ہیں۔ کہ
"بعض بزرگوں سے سنا ہے، کہ لالہ گھنشام داس عاصی نے پڑھا تھا۔ وہ بھی شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ اور ان دنوں میں نوجوان لڑکے تھے۔ میں نے انہیں دلی میں حکیم سکھانند مرحوم کے مکان پر دیکھا تھا۔ بڈھے ہوگئے تھے، مگر طبیعت میں جوانوں سے زیادہ شوخی تھی۔ اس وقت کی باتیں اس طرح سناتے تھے۔ جیسے کوئی کہانیاں کہتا ہے۔"

اس وقت جبکہ اردو کو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہا جاتا ہے۔ اردو کے ہندو مصنفوں اور ان کی ادبی تصنیفات کے بارے میں صحیح اور بے تعصبانہ تحقیقات کی بڑی ضرورت ہے۔

عاصی کی قادر الکلامی کا خاص ثبوت ان کی متعدد غزلیں اور نظمیں ہیں۔ جن میں مشکل اور نادر ردیفیں انتخاب کی ہیں۔ اور کمال کے ساتھ انکو نبایا ہے، اور ان میں مضمون آفرینی کی ہے۔ دو غزلے سہ غزلے بھی خوب پائے جاتے ہیں۔ مطلع کی تکرار میں بھی ماہر تھے۔ ایک غزل میں ۵ مطلعے آتے ہیں۔ ایک مسدس بے نقط لکھی ہے۔ اور ایک فارسی غزل صنعت رقطع میں یعنی ایک حرف منقوطہ اور دوسرا غیر منقوطہ۔ مندرجہ ذیل نادر ردیفیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) زنجیر کلید و قفل بنی (۲) آہن میں ہے (۳) بجلی (۴) جلدی چلے۔ (۵) فلک کے اوپر زمین کے نیچے (۶) پھر ویسی ہی (۷) نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا۔ (۸) چمچخ۔ (۹) تیسوں

ردیف "تیسوں" کا نمونہ

---

[1] دیکھئے "آب حیات" مطبوعہ ۱۹۱۷ء صفحہ ۴۷۱ حالات شیخ ابراہیم ذوق۔

شمار انگشت[۲۰] دہ رنت و پا اور نقوشِ نعل[۴۸] فرس زمیں پر
خم دو[۲] ابرو صفوف[۴۸] مژگاں بنے ہلالِ صیام تیسوں[۱]
زبان[۱] و خامہ[۱] دہان[۱] و لب[۱] اور بنان دست[۱۰] و دو دست کاغذ
علوم چودہ[۱۴] ثنائیں تیری رہیں ہر صبح و شام تیسوں

حُسن تشبیہ اور شوخی ملاحظہ ہو :-

آئی محرم گوری کُچ اور تس پہ سنہری گوٹ لگی
ابر میں آیا چاند کا ٹکڑا برق کے دل پر چوٹ لگی

در پردہ ہم جو زلف لگے اسکی بھانپنے - بولے کہ تجھکو سونگھ لیا کالے سانپ نے

فلسفہ :- جنازہ پر لگائے نخل ماتم ہیں بتاشے ہیں
یہ دنیا وہ جگہ ہے یاں موئے پر بھی تماشے ہیں

اختلاف طبع :- جو ہیں کم اصل ان کا اصل سے پیوند کیونکر ہو
طلا پر رانگ کا ٹانکا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا -
مثل ہے جونک پتھر پر نہیں لگتی ہے اے عاصی
بتوں کے دل پہ ڈورا تیرا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

تفاخر :- بلبلِ باغ سخن وہ ہوں کہ میرے روبرو -
بند ہے طوطی کی اے عاصی دم تقریر چونچ
لکھے دیوانوں کے سینہ پہ ہیں اشعار ہمارے
جمع کرنا ہے مشکل آپ کے دفتر پریشاں کا

دن رات ہم جلیں یہ جلے رات بھر مدام ،
اے گُل بڑی یہ شمع ہوئی یا جلن میں ہم ،

حُسنِ تمثیل :- یہ آثارِ اجل سمجھو جو پُشت اے یار ٹیڑھی ہو
خطر ہے بے گماں گرنے کا جب دیوار ٹیڑھی ہو
چشم گریاں مری لے جائیو تو اے دہقاں
بارشِ ابر تری کشت پہ گر کم ہو دے -

روزمرہ :- پڑھائی اُلٹی پٹی کس نے ان کو ہے خدا جانے

ہماری راستی پر بھی گماں کرتے ہیں بہتاں کا
عزیزو ضبط اشک دیدۂ تر ہو نہیں سکتا
کروں کیا بند کوزے میں سمندر ہو نہیں سکتا

شگفتگی :۔ عطرِ الفت لگا دیا کس نے بوئے گُل میں بسا دیا کس نے
تجھکو آئینہ لا دیا کس نے دلِ عاشق دلا دیا کس نے
محوِ نظارہ کر کے خلقت کو گھر کا رستہ بھلا دیا کس نے

آمدِ خط :۔ خط سے نمود اور ہوئی حسنِ یار کی
گھونٹی بھی اک خزاں سے نہ اکھڑی بہار کی
خاطر ہے چوں چکور ہیں ایک یار کی
بلبل کی طرح کیوں کریں منت ہزار کی

اظہارِ بیتابی :۔ یاں کسی صورت سے تو آ۔ یا وہاں بلوا مجھے
صورت اپنی اے بُت آئینہ رو دکھلا مجھے

صنعت تجنیس :۔ یاد رکھنا کہ کبھی تم بھی نہ کل پاؤ گے
رات دن عاصی شیدا کو جو کلپاؤ گے

عشق کی عظمت :۔ برہمن دیر میخواند دلم را، شیخ بیت اللہ
ز فیض عشق دارم کعبہ و بتخانہ در پہلو

حُسنِ تخیّل :۔ نہ مسکرا لبِ دریا تو بیٹھ کر ظالم
کہیں نہ برق سے پانی میں آسماں جل جائے۔

عاشق کی صافگوئی ۔ نے حق ہی نکلتا نہ کبھی رام نکلتا
ہر دم ہے مرے منہ سے دلآرام نکلتا
کرتی نہ اگر خانہ خرابی تیری اُلفت
تو گھر سے یہ کیوں عاصیٔ بدنام نکلتا

عاشق کی تمنا :۔ وہ سو گئے ہیں ذرا شب ہے اک گھڑی باقی
الٰہی مرغ سحر کا اب آشیاں جل جائے

تمنائے موت :۔ ذائقہ موت کا عاشق جو بتایا کرتے

عیسٰی و خضر بھی مرنے کی تمنا کرتے

ندرتِ خیال:۔ اپنے دانتوں کی چمک آپ جو دکھلا دیں تو پھر
منہ نہ دکھلائے کبھی شرم کے مارے بجلی

بن اُس کے ذرا کل نہیں ہیہات مجھے اب
جس سے کہ مری آہ ملاقات نہیں اب

پہنچا زبان خار کو پانی کہ خشک ہے۔
گر تجھ سے چشم آبلۂ پا پہنچ سکے۔

خون کا میرے عوض ہو کر رہیگا دیکھنا!
حق نے چاہا تو حنا سے ہاتھ بندھواؤ گے تم

یہ شگوفہ ہے نیا گلدستہ کی حاجت نہیں
بن گئے برگ حنا ہیں ہاتھ میں پس پس کے پھول

خودداری:۔ آپ کے پاس یہ عاصی تو نہیں آسکتا۔
آپ جس وقت بھی چاہیں یہاں آسکتے ہیں۔

تجاہل عارفانہ:۔ نجومی دیکھنے ثمرہ ہیں قسمت کا ستاروں سے
یہ بویا آسماں پر بیج ہے کس پیرِ دہقاں کا

حسنِ بیان:۔ گر چمن میں ہو نہ وہ رشک چمن توا ے صبا
کس کا پھر سبزہ لبِ جو، باغ کس کا، کس کے پھول

کہنے سے جو کسی کے: سمجھے نہ آپ سے
ڈالے خدا کسی کا نہ اُس بدگماں سے کام

اُٹھ کے کوچے سے ترے ہم نہیں جا سکتے ہیں
گو اُٹھاتے ہیں قدم دل نہ اُٹھا سکتے ہیں

دلا ہم اور جاناں ایک ہی بستی میں بستے ہیں
ولیکن یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

سویدائے دل شیدا سے لے لے لطف تاریکی
کہ تاریکی میں باریکی ہے باریکی میں تاریکی

ضعف سے دل کی یہ حالت تھی کہ ہر ہر گام پر
مثلِ نقشِ پا ترے کوچے میں بیٹھا جائے تھا

صاف بیانی :- تمہارے دل کی خدا جانے پر قسم ہے مجھے
کہوں بُرا جو تمہیں تو مری زباں جل جائے

آزادانہ دھمکی اور خود داری :-

اور دلبر سے دل لگاؤں گا	شمع ساں پھر تجھے جلاؤں گا
لاکھ رشکِ عدن ہو تیرا گھر	جیتے جی تو اُدھر نہ آؤں گا
عشق کی گر کشش رہی دل کو	نہ سہی وصل مر تو جاؤں گا
پھوٹ کی آگ کیوں ہے بھڑکاتا	تو لگائے گا میں بجھاؤں گا

نام کو گر ہوں عاصیٔ عاشق
گالیوں کا مزا چکھاؤں گا

یہ طریق اچھا نہیں کچھ اے بُتِ خود کام ہے
ہم دعا کرتے ہیں تو دیتا ہمیں دشنام ہے

شوخی و ظرافت :-

مت یار کو چھیڑا سکے تو عاصی کہ مبادا
پھر یار گلے کا بُتِ گلفام کہیں ہو!

سر پہ آئی سحر اور نیند کے وہ جوش میں ہیں
للہ الحمد! وہ غافل ہیں تو ہم ہوش میں ہیں

جہاں کہ نقش قدم دیکھوں مہ جبیں کا میں
لب خیال سے بوسہ لوں اس زمیں کا میں

الٰہی خیر کیجو آج بے ڈھب بڑبڑاتا ہے۔
وظیفہ ہے یہ زاہد کا کہ ہے بحران ہذیاں کا

کعبہ چلے تو شیخ جی ہو تم وطن کو چھوڑ
مُنہ پر لگا کے ریش یہ ٹٹی شکار کی

آئیگی یاد دخترِ رز جب تمہیں، تو پھر

بھاگو گے واں سے کر کے سواری حمار کی
جھٹکا نہ دینا زلف کو زنہار دیکھنا
اٹکا ہے اس میں یہ دل بیمار دیکھنا
میرے گریہ کا سن کر ماجرا اس نے کہا آخر
کہ اس برسات میں آنا ترے گھر ہو نہیں سکتا
مان یاروں کا کہا بہرِ خدا اے عاصی
دل بتوں سے تو مری جانؔ زنہار لگا
دُختِ رز پردۂ مینا سے لڑاتی ہے جو آنکھ
شاید آپہنچا ہے تنہا کوئی میخوار نیا
مرغِ دل صید تجھے تیرِ نگہ کر ہی رہا۔
نہ بچا پر نہ بچا۔ ایسا پھنسا مر ہی رہا۔
شب جبکہ کہا میں نے نہ جاؤ ابھی ہے رات
زلفوں کو اُٹھا کر یہ کہا۔ رات نہیں اب
کس کے گھر آپ کو ہے رات کو جانا منظور
آپ جو زلف پریشاں کو بنا کر بیٹھے
میں ہوں یا تم ہو، نہیں اور کوئی خلوت میں
پھر بھلا کس لئے مکھڑے کو چھپا کر بیٹھے
عید کا دن ہے ذرا بھولے سے لگ جاؤ گلے
آج کے دن ہچکچانا اور بہانہ منع ہے
حسنِ تشبیہ و استعارہ :۔
کشتۂ دیدۂ فتاں کو تو بادام نہ بھیج
پختہ مغزانِ جنوں کو ثمرِ خام نہ بھیج
چڑھے جو بام پہ تم کر گیا کنارا چاند
اب آؤ جانے دو۔ تم جیتے اور ہارا چاند
حسن کی گرمی سے آہو نے نکالی ہے زباں

کب قریبِ چشم یہ سرمے کا دنبالہ ہے آج
عاصی کی شب و روز جو گریاں رہیں آنکھیں
پھر کون بھلا کہوے کہ برسات نہیں اب

شمع گریاں میری بالیں پر نہ لانا ہمدمو
سامنے بیمار کے مغموم آنا منع ہے۔
مرے گریہ کا سُن کر ماجرا اس نے کہا آخر
کہ اس برسات میں آنا ترے گھر ہو نہیں سکتا

زلف کو جنبش ہوا سے یوں خط و عارض پہ ہے
سبزۂ نورستہ پر جوں ناگنیں جلدی چلیں

لُطف بیان :-

دلا ہے یہ بلا اس کاکلِ پیچاں کی لٹ کالی
غضب ہے کاٹ کر جاوے جو یہ ناگن اُلٹ کالی
خفقط دل کو مرے کیا پیچ میں دستار کے باندھا
کہ جانِ زار بھی شملے میں لے کر اسنے لٹکالی
اِدھر اپنے رُخِ روشن پہ زلف اُسنے پریشاں کی
اُدھر خورشید پر چھائی گھٹا بس آکے جھٹ کالی
سیہ چوڑی نہیں ہے ساعدِ سیمیں پہ اے عاصی
یہ شاخِ صندلی سے ہے گئی ناگن لپٹ کالی

"کلامِ عاصی" کے مسودہ کی ترتیب میں میرے والد بزرگوار نے بہت مدد دی ہے۔ اور کلام کے مشکل حصوں کو سلجھانے میں میرے قابل اُستاد علامہ برجموہن دتاتریہ کیفیؔ نے بڑی عنایت فرمائی ہے۔ میں اِن دونوں کرم فرماؤں کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

منموہن لال (ایم اے)
پروفیسر ہندو سبھا کالج امرتسر
اکتوبر ۱۹۳۹ء

کلامِ عاصی

(دہلوی)

[illegible]

([illegible])

ادم

کلامِ عاصی

ردیف الف

ظہورِ خلق میں خالق سے پُر ہے نورِ عرفاں کا
تعلق دل پہ ظاہر ہو گیا یوں جسم کا جاں کا
وجودی اور شہودی میں مشرفِ حق ہے انساں کا
نفس کی آمد و شد پر ادا ہو شکرِ یزداں کا
اگر وحدت کو کثرت میں کسی نے غور سے جھانکا
تو ہست اور نیست میں دیکھا تماشا رازِ پنہاں کا
کیا جب آہ کے مصرع کو بسم اللہ دیواں کا
تو ہر بیتِ ورق نے چاک دکھلایا گریباں کا
قفس میں مرغِ دل تھا دوست تھے اس دشمنِ جاں کا
مِٹا نقشِ ازل جس نے دکھایا وصلِ جاناں کا
خطِ ریحاں سے چمکا حسن دونا روئے جاناں کا
چڑھایا بوستاں پر حاشیہ کس نے گلستاں کا
خیال آیا جو زخمی کو ایسی الیدہ دنداں کا
تو ہر زخمِ جگر پر چیونٹی کا لگ گیا ٹانکا

ہُوا ذوقِ شکار اُس کو وہاں کیا طائرِ جاں کا
یہاں پھندا گلے میں پڑ گیا تارِ گریباں کا

دمِ شمشیر آبِ خضر ہو گر بسملِ جاں کا
تو شورِ قُم باذنی شور ہو گورِ غریباں کا

لبِ پاں خوردہ کی سُرخی سے ہیں بس قدر عالم ہیں
کوئی پرساں نہیں ہوتا عقیق و لعل و مرجاں کا

انہیں غیروں سے کب فرصت وہ سنتے بات ہیں کس کی
سنائیں کس طرح احوال اس دم بھر کے مہماں کا

خمِ ابرو کے آگے سر جھکانا عین ایماں ہے
شہیدِ عشق ہی پاتا مزا ہے عید قرباں کا

زباں پر تشنگی سی پڑ گئی، کانٹے پڑے اتنے
تپِ سوزِ دروں لیتے ہیں جن سے کام سوہاں کا

نجومی دیکھتے ٹھہرا ہیں قسمت کا ستاروں سے
یہ بویا آسماں پر بیج ہے کس پیرِ دہقاں کا

جلن میں رات دن ہم اور وہ اک رات جلتی ہے
لگن میں مرتبہ کم مجھ سے ہے شمعِ شبستاں کا

جھڑی آٹھوں پہر آنکھوں سے اشکوں نے لگائی ہے
اُٹھے گا ایسا طوفاں قافیہ ہو تنگ باراں کا

ارے زاہد تری شہوت پرستی ہو گئی ظاہر
فقط اک نفس کی خاطر یہ چرچا حور و غلماں کا

مریضِ عشق کی صورت ہوئی یہ دردِ فرقت سے
کہ مُنہ کھولا ذرا جس نے اُسی دم کھول کر ڈھانکا

یہ وہ ہے عشق پیچا پیچ میں جس کے پھنسا دل ہے

کھُلا ہرگز نہیں پھندا اسیرِ زلفِ پیچاں کا
وُہی خورشید جس کے حسن سے عالم منور ہے -
بنا ظلمت میں تارا حسنِ یوسف چاہِ کنعاں کا
جبھی فرماں روائی عشق میں عاشق کی پائی ہے ۔
کہ سر دینے پہ ہے تیار، تابع ہے یہ فرماں کا
ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں سر ہم جاں نثار اپنا
ہمیں درد و سر ہرگز نہیں منت کشِ درماں کا
سخن فہمی، سخن سنجی، سخن دانی کی نکہت سے
دماغ ہوتا معطر شعر سے ہے ہر سخن داں کا
لبوں پر جان ہے اک بوسۂ لب کی تمنا میں
فقط اک بوسہ ہی قیمت ہے میرے دین و ایماں کا
بھروسہ ہے اگر کچھ دل میں، تو ہے اس کی رحمت کا
اگر بخشش کا ہے سودا، تو ہے اس جنسِ عصیاں کا
الٰہی! خیر کیجو، آج یہ ڈھیٹ بڑبڑاتا ہے -
وظیفہ ہے یہ زاہد کا، کہ ہے بحران ہذیاں کا
وفا کی کیا توقع ان جفا پیشوں سے ہو دل کو
بدلنا ہر گھڑی آساں ہے جن کو عہد و پیماں کا
ہمیں جب دیکھتے ہیں وہ نقاب افگندہ آتے ہیں
نکلنا ہے بہت مشکل ہمارے دل کے ارماں کا
پڑھائی الٹی پٹی ان کو کس نے ہے خدا جانے
ہماری راستی پر بھی گماں کرتے ہیں بہتاں کا
لکھے دیوانوں کے سینوں پہ ہیں اشعار عاصی کے
جمع کرنا ہے مشکل آپ کے دفترِ پریشاں کا

گھر کیونکر کریں دل میں مرے حسرت و یاس آ
بیٹھے جو صنم پہلو بہ پہلو مرے پاس آ
دُوری نے ستایا ہے تو جلدی مرے پاس آ
اخلاص و محبت کا ذرا گر ہے تو پاس آ
وسواس کو جب دل میں نہ دے راہ تو اپنے
خالی ہے مکاں غیر سے بے خوف و ہراس آ
دے بندِ غم و رنج سے تو آ کے رہائی
فرقت میں نہ رکھ دل کو بچارے تو اُداس آ
دیدار دکھا اپنا کہ اب طالبِ دیدار
کوچے میں کھڑے ہیں ترے پیارے چپ و اُداس آ
گلشن میں تجھے آگ لگانی ہے جو منظور
کر زیبِ بر و دوش تو گلرنگ لباس آ
ہجراں میں بھلا زیست ہو کس طرح مری جاں
عاصی کی ذرا بریں تو یہ کر کے قیاس آ

خاکِ در پر تری گر یہ نہ جبیں سا ہوتا
تو فروغ اس مہِ انور کا نہ اتنا ہوتا
چاک زنہار روشِ گل کے نہ سینا ہوتا
عشقِ گلرو نہ اگر ہار گلے کا ہوتا
کیوں پریشانیٔ خاطر ہمیں ہوتی گر دل
نہ گرفتارِ خمِ زلفِ چلیپا ہوتا
ہم میں اور تجھ میں بہم خوب لڑائی ہوتی
تو نے گر دیدہ کہیں اور لڑایا ہوتا

دردِ پہلو میں مرے کس لئے اُٹھتا ظالم
وہ دلارام مرے پاس جو بیٹھا ہوتا
کاشکے مُرغِ دلِ زار اگر عاصی کا
آپ کی ناوکِ مژگاں کا نشانہ ہوتا

نے حق ہی نکلتا ، نہ کبھی رام نکلتا
ہر دم ہے مرے مُنہ سے دلارام نکلتا
عشاق کا دم ہے بُت خود کام نکلتا
جب گھر سے تو ہاں لے کے ہے صمصام نکلتا
چھٹ آہ کے کچھ اَور ترے دھیان میں مُنہ سے
ہرگز نہیں اے زلفِ سیہ فام نکلتا
حسرت دلِ شیدا کی نکل جاتی جبھی رنگ
گرجی بھی ترے آگے گُل اندام نکلتا
ق
ہر لحظہ ترا ذکر مرے وردِ زباں ہے،
ہر دم مرے مُنہ سے ہے ترا نام نکلتا
اور تیری یہ خوبی ہے کہ تو مجھکو شب و روز
رستے میں ہے دیتا ہُوا دشنام نکلتا
کرتی نہ اگر خانہ خرابی تیری اُلفت
تو گھر سے یہ کیوں عاصی بدنام نکلتا

عزیز و ضبطِ اشکِ دیدۂ تر ہو نہیں سکتا۔
کروں کیا بند کوزہ میں سمندر ہو نہیں سکتا

ابھی ناداں ہے قاتل خوفِ خوں سے ہاتھ کانپے ہے
رواں حلقوم پر میرے جو خنجر ہو نہیں سکتا
یہ ہے سنگیں دلی بعد فنا بھی خاک میں اپنی
کہ تیرِ صید افگن غرق لگ کر ہو نہیں سکتا
دکھا دیتے حباب آسا جب اکر نقش پانی پر
کریں کیا اپنا جینا آہ دم بھر ہو نہیں سکتا
مرے گریہ کا سُن کر ماجرا اُس نے کہا آخر
کہ اِس برسات میں آنا ترے گھر ہو نہیں سکتا
دیا نامہ کبوتر نے تو پڑھ کر حالِ دل بولے
دلِ صد چاک تو بالِ کبوتر ہو نہیں سکتا
قدم خارِ بیاباں چوم کر میرے یہ کہتے ہیں
کہ مجنوں بھی ترے اب تو برابر ہو نہیں سکتا
تو وہ ہے موم دل اے شمع جلتی اور روتی ہے
بھلا کیا ضبطِ گریہ تجھ سے پل بھر ہو نہیں سکتا
بجھانا آتشِ دل کا مری کچھ کام رکھتا ہے
ذرا سا کام تجھ سے دیدۂ تر ہو نہیں سکتا
چمکتے ہیں ہمارے داغ سینہ کے وہ اے عاصی
پرِ طاؤس بھی جن کے برابر ہو نہیں سکتا

وہ بزمِ غیر میں پہلے اِدھر نہیں آتا
جو ساتھ جذبۂ دل پر اثر نہیں آتا
اُسی کو رحم بزخمِ جگر نہیں آتا
وگرنہ کونسا دل ہے کہ بھر نہیں آتا

جفا پہ گر نہ کمرِ کینہ ور نہیں آتا،
تو مہرِ صبحِ قیامت نظر نہیں آتا
بھٹک سے طائرِ سیماب گھر نہیں آتا،
چٹک کی آتشِ گُل سے شرر نہیں آتا
یہ سچ ہے چینٹی کے جبتک کہ پر نہیں آتا،
بزیرِ تیغِ اجل اس کا سر نہیں آتا
دلا ہیں گور کے ہاتھوں سے بر نہیں آتا،
جو پاؤں قبر میں ڈالے تو سر نہیں آتا
اُٹھا لے ہاتھ مری نبض سے مسیحا دم!
مریضِ عشق ہوں بچتا نظر نہیں آتا
جو دستگیر وہ خضرِ خجستہ پے ہوتا،
تو بحرِ عشق کا ڈوبا اُبھر نہیں آتا
ہنسے ہے زخمِ دل اپنا ترے تدارک پر
علاج اس کا تجھے ڈاکٹر نہیں آتا
طلب میں بوسۂ لب کی ہے حرفِ مطلب بند
سرورِ دل بہ لبِ مشتہر نہیں آتا،
بعشقِ شعلہ رخاں ہوں نہالِ گُل ریزی،
خزاں سے کچھ مجھے خوف و خطر نہیں آتا۔
جلی ہے نام سے میرے چمن میں بادِ صبا،
بسیرا لینے کوئی جانور نہیں آتا،
نہ جانتا تجھے کوئی بہ حسن میں فسانہ ہا،
جو تیرے ہاتھ سے سر بے اثر نہیں آتا
نہ دیتا جان جو عشق بتانِ شیریں میں،

تو آبِ رفتہ بجوئے شکر نہیں آتا
شبِ فراق میں سیکھ آکے اذیتِ قاتل!
تجھے جو قتل بطرزِ دگر نہیں آتا
بس ہم نے دیکھ لیا تجھ کو سوزنِ عیسیٰ!
طرازِ بخیۂ چاکِ جگر نہیں آتا
جبھی فلک سرِ نخوت کو جانتا ہے بلند
تلے پہاڑ کے جب تک شتر نہیں آتا
سناؤں مطلع وہ عاصی تجھے بقولِ رقم
کہ جس کے سامنے شیرِ ببر نہیں آتا

مطلع

جہاں میں کونسا ہم کو ہنر نہیں آتا
لگا کے دل کا چھڑانا مگر نہیں آتا

رُکا ہے آن کر سینے میں دم لب پر نہیں آتا
گلے جھگڑا پڑا ہے یہ سر کیوں خنجر نہیں آتا
کلام اُن سے کروں کیا پہلے ہی سر پر نہیں آتا
گلہ دل میں بھرا ہے جو ذرا منہ پر نہیں آتا
عیادت کے لئے بھی وہ دمِ آخر نہیں آتا
لبوں پر آگیا ہے دل مگر دلبر نہیں آتا
مرے بن اپنے پیچ ہے کس نے دیکھا رُوئے جنت کو
صدف کی جان جائے بن گہر باہر نہیں آتا
اُلٹ مارا ڈسا جس کو دہانِ مارِ گیسو نے
کسی کو اس کا عاصی آج تک منتر نہیں آتا

؎ رقم تخلص حکیم سکھانند دہلوی کا جو اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے

میری چاہت کا جو دم وہ بُتِ ترسا بھرتا
نقشِ حُبّ[1] اس کے لئے کیوں میں خدایا بھرتا

نمک افشانیٔ شبنم جو نہ ہوتی ہر صبح
گُل کا زخمِ جگر اے بلبلِ شیدا بھرتا

مُرغِ بسمل کی طرح میں ہی نہ تڑپا دمِ ذبح
ورنہ دامن یہ ترا خون میں سارا بھرتا

رشکِ گُل بُوئے وفا کچھ بھی جو ہوتی تجھ میں
جس طرح بنتی ترے ساتھ میں مرتا بھرتا

خواب میں دیکھ کے تجھ اسکا جو چونک اٹھتا ہوں
آہیں اس واسطے ہوں اے شبِ یلدا بھرتا

دیکھتا گر تیری اے صید فگن شوخیٔ چشم
چوکڑی پھر نہ کبھی آہوئے صحرا بھرتا

آسیا وار نہ پھر دانۂ اختر ہوتے
شکم اے پیرِ فلک کیا نہیں تیرا بھرتا

رُوکشی اُس نے نہ کی تیرے دہن سے ورنہ
غنچہ کچے[2] گھڑے پانی یہ تمنا بھرتا

قطعہ

جگر اور دل تو ہیں دو اور تیری مژگاں کے خدنگ
نقدِ آتے ہیں بہت کس کا میں بھرنا بھرتا

ایک اگر ہوں تو بھروں اسکا دہن شکر سے
خاک سے مُنہ بھی ستمگر نہیں سو کا بھرتا

---

[1] محبت پیدا کرنے کا تعویذ [2] مشکل سے مشکل کام کرنا۔

قطعہ

خانہ زاد ایک ہی گلشن کے ہیں یہ دونوں تیرے
چاہیئے تھا، کہ برابر ہوا نہیں رکھتا بھرتا
خار پر بھی نظرِ چشمِ عنایت تھی ضرور
گو یہ قلاّش تھا کچھ اس کا بھی بھرنا بھرتا
گُل تو زردار تھا کیا اس کے زر و سیم نہ تھے
تو جبھی بھرتے ہی کو ہے اے چمن آرا بھرتا

ہیں ہُوں دریائے سخن فیض ہے مجھ سے جاری
کوئی بھرتا ہے سبُو کوئی ہے کوزا بھرتا
کچھ نہیں اس میں ہے عاصی مری قسمت کا قصور
ظرف جتنا ہے کسی کا وہ ہے اتنا بھرتا

پھر سفر سے جو وہ رشکِ مہِ انور پلٹا
ہم یہ روشن یہ ہُوا اپنا اب اختر پلٹا
ہائے یہ دورِ قمر دیکھا تو اکثر پلٹا
پر مرا طالع برگشتہ نہ کافر پلٹا
گر نہیں تجھکو غمِ عشقِ گُلِ اندام، تو کیوں
رنگ چہرے کا ترے اے دلِ مضطر پلٹا
جاں بری پھر تو دلا ہو دے گی دشوار، اگر
کاٹ کر افعیِ گیسوئے معنبر پلٹا

ؔ سانپ کاٹ کر اگر پلٹے تو پھنکار ہو جاتا ہے

یوں در یار پہ ہوتا ہوں تصدق ہر دم
تڑپ یوں کھائے ہے گرہ[1] آن کبوتر پلٹا

آشنا تھے سو وہ کر لے گئے بیگانہ وشی
کس قدر ہائے زمانہ یہ ستمگر پلٹا

یار نے قصد جو آنے کا کیا پھر عاصی
بخت برگشتہ یقیں ہے کہ مکرر پلٹا

گھر سے میں صبح کے بعد نکلے نہ در تک پہنچا
ماہ رخسار کے اے وائے نہ گھر تک پہنچا

کیا تعجب ہے اگر طالع نیکو پھر بھی
دے مجھے بزم بت رشک قمر تک پہنچا

کہدو یہ بہر خدا اس سے کہ اے ابر کرم
آپ کو زود تر اس تشنہ جگر تک پہنچا

جنبش ناز و غم ہجر سے مرتی ہے آہ
یہ خبر دو کوئی گوشش محل تر تک پہنچا

وعدہ کے دن بھی نہ اے وعدہ فراموش آیا
اور نہ یاں آن کے تو روز دگر تک پہنچا

گوہر اشک وہ خوش آب ہیں اپنے جن کا
ذکر اوصاف دلا کان گہر تک پہنچا

راہ میں اس سے جو منظور ہے ملنا عاصی
آپ کو اس کی ذرا راہ گذر تک پہنچا

---

[1] سدھا ہوا کبوتر جو لوٹ کر واپس آجایا کرے

ہوگیا ہائے یہ آخر ترا بسمل ٹھنڈا
پہ تو اب تک نہ ہُوا اے بُتِ قاتل ٹھنڈا
آتشِ غم کی رہی یاں بھی وہی گرمی، آہ
نہ ہُوا آ کے کلیجہ بھی تہِ گِل ٹھنڈا
عشق کے سوختگاں کا جگرا ہے بحر رواں
خاک ہو بیٹھ کے تیرے سرِ ساحل ٹھنڈا

قطعہ

نہ فقط گریہ کناں ہے، کہ ترے ہجراں میں
کھینچتا دم ہے تیرا عاشقِ بسمل ٹھنڈا
بس پہ یہ حال ہے اسکا کہ کبھی جسم ہے گرم
اور کبھی اے بُتِ رشکِ مہِ کامل ٹھنڈا
الغرض آن کے اب آگ کو فرقت کی بجھا
سینۂ سوختہ کو کر تو ذرا دِل ٹھنڈا

ہوگیا فیض سے اُستاد کے آساں عاصی!
گرچہ بٹھلانا یہاں گرم تھا مشکل[1] ٹھنڈا

اشکِ گلگوں بھری کیا چشم سے اے دل ٹپکا
جگر اب ٹکڑے ہُوا اشک سے خوں مِل ٹپکا
آتش افروختہ دریا میں وہیں ہووے گی،
اشکِ گرم اپنا کبھی جو لبِ ساحل ٹپکا

---

[1] بہت مشکل

ہم ہیں کیا رونے لگے، دیدۂ ساغر سے بھی اشک
تیرے اُٹھتے ہی شب اے رونقِ محفل ٹپکا
قبر میں بھی نہ ہُوا خشک ذرا دیدۂ تر،
لگ رہا ہے میرے اشکوں کا تہِ گل ٹپکا
تشنہ لب یہ تیرا بسمل ہے تو مُنہ میں اُسکے
بوند پانی کی ذرا اے بُتِ قاتل ٹپکا
ابر خجلت سے ہُوا آب وہیں جب ہمدم
چشم سے اشک میرے اسکے مقابل ٹپکا
ہو گیا فیض سے اُستاد کے اپنے آساں
گرچہ عاصی تھا بٹھانا یہاں مشکل ٹپکا

تصور کیا بندھا مجھکو تیری مژگاں کی برچھی کا
جو دشمن ہو گیا میں اپنے ہاتھوں اپنے ہی جی کا
یہی صحرا یہ شاید آگیا جس میں کہ مجنوں تھا
جو رُک رُک کے لگا چلنے یہاں سے ناقہ لیلیٰ کا
نہ نکلا کوئی مطلع مثلِ بیتِ ابروئے جاناں
کہ ایک ایک ورق دیکھا میں نے دیوانِ ہلالی کا
نکال اب خانۂ زنجیر سے جوشِ جنوں مجھکو
کہ ہیں یہ سیر کے دن اور ایک عالم ہے مستی کا
جو کانپیں رات دن ہیں خوف سے شمس و قمر ہمدم
کہیں شاید ہُوا ہے شوق اُسکو گیند بازی کا
کوئی اس بحرِ خوبی سے یہ کہدو اب کہ بن تیرے
یہ حال اپنا ہے جو احوال بن پانی ہو مچھلی کا

جب میں اپنے دل اس کی ہُوا کچھ سیر کا عاصی
نہ دیکھا اس نے پھر بارِ دگر دیوان لیلی کا

قتل سے میرے پھرا مُنہ خنجرِ فولاد کا
لوہا گیا قسمت سے ٹوٹا اس ستم ایجاد کا

عشق ہم جب جانتے سرو سہی آزاد کا
طوق پڑتا گردنِ قمری میں جب فولاد کا

رہ گیا تسمہ گلوئے عاشقِ ناشاد کا
ہونا منّت کش، پڑا پھر ساعدِ جلّاد کا

کھینچ کر نقشہ میرے اُس غیرتِ شمشاد کا
ہے دماغ عرشِ بریں پر مانی و بہزاد کا

دل ہُوا مائل جو زُلفِ لیلئ بیداد کا
قیس نے ہمکو لکھا نامہ مبارکباد کا

ہاتھ آیا بلبلِ بُستاں جو حُسن آباد کا
بن گیا عشرت کدہ شادی، سے گھر صیّاد کا

ہے بگولا اک ہوا خواہوں میں اے جذبِ جنوں
حال کیا پوچھے ہے تو مجھ خانماں برباد کا

خونفشانی سے مری وقتِ طپیدن دیکھنا،
رشکِ گلشن ہوئے گا صحنِ قفس صیّاد کا

زاہدا اِس سے بندھے کیا نیتِ عقدِ نماز
رات دن ہو فکر جسکو طعمۂ اولاد کا

شعلۂ آواز سے ہر مُرغِ آتش خوار کے
ہو گیا بھسمنت[1] لگ کر آگ گھر صیّاد کا

[1] جل کر راکھ ہو جانا

سخت جانی پر مری قاتل تیری سنگیں دلی،
کیا بیانِ آسیا یہ نقش ہے ہمزاد کا
صورتِ نقشِ قدم بیٹھا ہی جاتا ہے جو دل
ہے فراموشی میں یارب خوف کس کی یاد کا
چیر کر سر کو خیالِ مانگ میں تیشہ سے ہل،
لانا جوئے شیرِ شیریں کام تھا فرہاد کا
واں بڑھائیں بیڑیاں پائے صنم سے عشق نے
یاں گھٹا یا قبانہ زنجیر مجھ ناشاد کا
دیکھئے انجام کیا آغازِ الفت کا ہو دل
ہے بُرا تیور مری جانب ستم ایجاد کا
چھوڑ دو پیری میں اب تم سادہ رویوں کی تلاش
وقت آپہنچا میاں عاصی خدا کی یاد کا

چشم پہ مژگاں، مژگاں پر دل، دل پہ آبلہ ہے نم کا
بحر پہ خس ہے خس پر شیشہ، شیشہ پہ ساغر ہے رَم[۱] کا
ذقن پہ خط ہے، خط پہ عرق ہے، عرق پہ لٹ ہے گیسو کی
چاہ پہ سبزہ، سبزہ پہ شبنم، شبنم پر افعی سم کا
چشمہ پہ چشم ہے، چشم پہ مردم، مردم پر ہے تیرِ مژہ
آپ پہ مچھلی، مچھلی پہ خضر، خضر پہ عصابہ[۲] مریم کا

۱ے ایک قسم کی شراب
۲ے وہ کپڑا جو عورتیں سر پر باندھتی ہیں۔

بینی پہ قشقہ[1]، قشقہ پہ ٹیلا[2]، ٹیلی پہ بوند پسینے کی،
نخل پہ ٹہنی، ٹہنی پر گل، گل پر ہے قطرہ شبنم کا
عارض پر تل، تل پر کاکل، کاکل پر تعویذِ طلا
چاند پہ تارا تارے پہ بدلی، بدلی پر خورشیدِ عالم کا
چشم پہ ابرو، ابرو پہ افشاں، افشاں پر ہے رنگِ گلال
سان پہ تیغ اور تیغ پہ جوہر، جوہر پر خونِ عالم کا
لب پر دنداں، دنداں پر پان، اور پان پہ مزیب خالِ مِسی
مرجان پہ دُر، دُر پر لالا، لالے پہ دانہ نیلم کا
رُخ پہ عرق، عرق پر جُھمکا، جھمکے پر حلقۂ زلفِ سیاہ
مہر پہ شبنم، شبنم پر گل، گل پہ ہے پھندا ریشم کا
شش جہت اندر ہیں اے عاصی ہم نے صریحاً دیکھ لیا
مِل کے خمیر آدمِ خاکی صفرا، سودا، بلغم کا

صاحبِ طاقت کو ڈر ہوتا ہے تھوڑا سانپ کا
تیر پر چڑھتا ہے جو کرتا ہے کوڑا سانپ کا
سایۂ گیسو نے ایسا دانت توڑا سانپ کا
پھن پٹکتا رہ گیا جوڑے کا جوڑا سانپ کا
طفلِ بنگالی نے شب افسوں یہ چھوڑا سانپ کا
زہر کا دریا چڑھا چھالا جو پھوڑا سانپ کا
مانعِ حسنِ پری تھی آئینہ میں شب وہ زلف
ہو روشن مت آ ادھر رہتا ہے جوڑا سانپ کا

---

[1] ٹیکہ جو ماتھے پر لگاتے ہیں، اور اسکی لکیر اکثر زرجی سینک سے بناتے ہیں۔
[2] گوندی ہوئی بوندی جو اکثر ماتھے پر بناتے ہیں۔

او کھلاڑی اس گھڑی کیڑا ہے جھنجھلایا ہُوا
چھیڑ کر ظالم دکھائے مت دو دوڑا سانپ کا
ہے یہ کمرتن چوٹ کر بیٹھا تو کہ دینگے تجھے
کیا پکڑنا جانتا ہے یہ نگوڑا سانپ کا
ایسے زہریلے کو کرلایا جو ملتے آیا ہُوا۔
ہاتھوں ہاتھ ہیہات شاید سم نچوڑا سانپ کا
ناگ پور اور سانپلا بے وجہ کیوں جانے لگے،
دِلی کے کھنڈروں میں عاصی کیا ہے توڑا سانپ کا

کیوں نہ رتبہ آسماں پر ہو زمیں کے پھُول کا
جب رکھے سر پر وہ طُرّہ یاسمیں کے پھُول کا
ساغرِ لعلیں نہ توڑے کس طرح خجلت سے مہر
ہے کٹورا ہاتھ میں اس مہ جبیں کے پھُول کا
طرز دکھلایا ہے اِک جلوہ میں ہر گردش نیا
اُس بُتِ نقاش چیں نے سیر بیں کے پھُول کا
چادرِ مہتاب میں لوگا نہ لگ جائے کہیں
مجھکو ڈر ہے اپنی آہِ آتشیں کے پھُول کا
آتشِ گل سے عبث ہے دل میں پروانے کے خار
اسکے ہے جرکا لگا شمعِ شبیں کے پھُول کا
ایک شیشی پھُول کی بھر کر تجھے لادیں گے ہم
ایکے گھان اُترا اگر اس نازنیں کے پھُول کا
تھان پر بھولا برا مالک کو، جو لے اسکو خوب
عیب یہ لکھا ہے گھوڑے کی جبیں کے پھُول کا

لہ کیڑا بمعنی سانپ

پھلجھڑی اس کی بنی ہے رشکِ گلزارِ خلیل
یا نمونہ ہے کسی خلدِ بریں کے پھول کا

اور وہ نافرمان و داؤدی کی چادر دیکھکر
رنگ فق ہو جائے ہے نقاشِ چیں کے پھول کا

لکھنؤ میں گرچہ رنگینیٔ مضموں ہے ۔ مگر
رنگ ان کے پاس ہے کچھ کچھ یہیں کے پھول کا

اسکو ہم دکھلا دیں اے عاصی بھلا گو لریں پھول
کھینچ دیوے عطر جو نقشِ نگیں کے پھول کا

غمِ ہجراں سے سینے میں دلِ پُرخوں نہ ٹھہرے گا
نہ آیا آج بھی قاتل تو یہ مشغوں نہ ٹھہرے گا

مسی آلودہ لب پر ہوئے گا جب رنگِ پاں ظالم
تو خیلِ عاشقاں پر کس طرح شبخوں نہ ٹھہرے گا

کیئے ہیں عہد و پیماں خوب لیکن یہ سمجھ رکھنا
کہ قول و وعدہ پر وہ اے دلِ محزوں نہ ٹھہرے گا

سُنے گا جب خبر وہ ناقۂ لیلیٰ کے آنے کی
یقیں ہے ایک دم صحرا میں پھر مجنوں نہ ٹھہرے گا

نکالے جب گئے آدم فقط گندم کے کھانے سے
نہ حورانِ بہشتی حُسنِ گندم گوں نہ ٹھہرے گا

حاشیہ صفحہ ۳۳ ۔ ۱ دو دوڑا ۔ آبلہ (زہر کا جو سانپ کے دانتوں کے اوپر زہر کی تھیلی ہوتی ہے ۲ سانپ کا گلا دبا کر زہر کے آبلہ کو چھوڑ دینا ۳ لو لگنا ۴ شرارہ ۵ ستارہ پیشانی ۔ ۶ پھولوں کی قسمیں ۔

جو کوٹھے پر تم آؤ گے ، بقول مصرعِ منشی[1]،
تمہارے سامنے سورج سرِگردوں نہ ٹھہرے گا

قطعہ

یہ جانوں ہوں میں اے ظالم کہ کہنے سے کسی کے بھی
تو وقتِ شب بہ بزمِ عاصیٔ محزوں نہ ٹھہرے گا
ولے جب اشک برسانے لگے گا عاصیٔ محزوں،
تو پھر اس دم بھلا کس طرح سے دیکھوں نہ ٹھہرے گا

کبھی اشکِ رواں یک دم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
بہے بن دیدۂ پُرنم نہ ٹھہرا ہے ، نہ ٹھہرے گا
تو اپنی خوبروئی پر غرور اتنا نہ کر ناداں!
کہ ہر گز حسن کا عالم نہ ٹھہرا ہے ، نہ ٹھہرے گا
یہاں سے جائیں گو پیغام بر اب سینکڑوں لیکن،
پیامِ وصل واں ہمدم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
دلِ بیتاب کو آئے قرار اے ہمدمو کیونکر
کہ پارہ جانتے ہیں ہم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
رہے سر پیٹنے سے باز کیونکر عاشقِ غمگیں
کہ دستِ لعبتِ[2] ماتم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
کیا اقرار گو اس نے ولے اقرار پر ہرگز
وہ بدعہد اے دلِ پُرغم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا

---

[1] نام ایک شاعر کا
[2] گڑیا۔ جو سینہ اور سر پیٹتی ہوئی بنائی جاتی ہے۔ اور کوک سے چلتی ہے

مژہ پر اشک کیا ٹھہرے کہ نوکِ خار پر عاصی
کبھی اِک قطرۂ شبنم نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا

رُخِ رنگیں کو نہ تیرے گُلِ گلزار لگا،
جعدِ مشکیں سے نہ وہ نافہ تاتار لگا،
یا گلے اپنے مجھے آ کے ستمگار لگا،
یا گلے پر مرے اک کھینچ کے تلوار لگا
اک نگہ بس ہے مِرے قتل کو قرباں تیرے
تیر مت آہ لو اے شوخ کماندار لگا
کر کے بسمل مجھے مت چھوڑ تو اب بہرِ خدا
تیغ اک آدھ بھی ہاں اے بُتِ عیار لگا
یہی ارمان ہے ہیہات دلِ زار میں بس
کہ میرے ہاتھ کہیں یار رو نہ دلدار لگا
اب جو ملتا نہیں ہم سے تو یہ معلوم ہُوا
کہ رقیبوں سے کہیں دل تیرا اسے یار لگا
ایک دن رشک سے کھا جائیگا میٹھا ورنہ
نیشکر کو کبھی تو منہ سے نہ زنہار لگا
مان یاروں کا کہا بہرِ خدا اے عاصی
دل بُتوں سے تو مری جان نہ زنہار لگا

مژہ سے مِل کے اشک اصلی نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
کنارِ دشت میں دریا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

چلے ہے سوزؔ چال ہاتھوں کے بل یاں اِس لئے مجنوں
کہ اس صحرا میں نقشِ پا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
کھپے ہے گردشِ چشمِ فسونگر عین مستی سے،
کہ آہو مشک نافہ کا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
عدم کی راہ سے آئے گا جو وہ درتشنا سنج ہیں،
رہیگا چرخ سال پھرتا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
شادے وہ غزل لکھکر بطرزِ نَو تو اے عاصی
کفِ دریا تہِ دریا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

اُٹھا جو آگ سے شعلہ نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
بسانِ طائرِ عنقا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
گلے خنجر کا زخم اصلی نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
بھنور میں آن کر تنکا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
زمینِ شور میں بوٹا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
بکشتِ خار رکھوالا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
ملاؤں اُس بسنتی پوش سے کس طرح دل یارو
کہ چمپی پر کبھی بھونرا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
جو ہیں کم اصل ان کا اصل سے پیوند کیونکر ہو،
طلا پر رانگ کا ٹانکا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا
بلا کو ہی غم خارا ہماری سخت جانی ہے
یہاں قاتل تیرا بھالا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

ا سر نیچا اور ٹانگیں اوپر کر کے ہاتھوں سے چلنا۔
۲ جھاگ۔

دلِ بیتاب کو کس طرح سینہ میں قرار آوے
دہانِ نار پر پارہ نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا۔
میں وہ فرماں روائے مُلکِ وحشت ہوں کہ صحرا میں
حریرِ عشق پر مجھ سا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا۔
مَثَل ہے جونک پتھر پر نہیں لگتی ہے اے عاصی
بُتوں کے دل میں ڈر تیرا نہ بیٹھا ہے نہ بیٹھے گا

اَور دلبر سے دل مِلاؤں گا — شمع ساں پھر تجھے جلاؤں گا
اپنے دودِ جگر سے زیرِ فلک — اک نیا آسماں بناؤں گا
جب سُنے گا تو حالِ گریہ زار — آگ پانی میں تب لگاؤں گا
مجھکو چھیڑو گے بزمِ غیر میں گر — سیدھی صلوات پھر سُناؤں گا
لاکھ رشکِ عدن ہو تیرا گھر، — جیتے جی تو اِدھر نہ آؤں گا
اضطرابی یہی رہی تو طبیب — ایسے جینے سے ہاتھ اُٹھاؤں گا
عشق کی گر کشش رہی دل کو — نہ سہی وصل مر تو جاؤں گا
پھوٹ کی آگ کیوں ہے بھڑکاتا — تو لگائے گا میں بجھاؤں گا
جب تصور کا بن گیا پُتلا — دل پہ تصویر کھینچ لاؤں گا
نخلِ خرما کی طرح زخم پہ زخم — قدِ شمشاد کو دکھاؤں گا
نام کو گر ہوں عاصیِ عاشق،
گالیوں کا مزا چکھاؤں گا،

جھٹکا نہ دینا زلف کو زنہار دیکھنا
اٹکا ہے اس میں یہ دلِ بیمار دیکھنا
حاصل نہیں علاج سے اے ہمدمو کہ جان

لے جائے گا یہ عشق کا آزار دیکھنا
پھک جائے گا یہ قصرِ برینِ فلک وہیں
کھینچوں گا جیب میں آہ شرر بار دیکھنا

قطعہ

کل اُس کے زیرِ قصر پکارے یہ رو کے ہم
دیوار کے تو رخنہ سے اے یار دیکھنا
اس سنگ دل نے پر نہ کسی سے بھی یوں کہا
نالاں ہے کون یہ پسِ دیوار دیکھنا
کہدو یہ مردماں کہ ذرا عین لطف سے
عاصی کی بھی طرف ذرا دلدار دیکھنا

شب کو نہ یارہ کا پاس اپنے جو بستر نہ ہُوا
اک دم آرام نصیبِ دلِ مضطر نہ ہُوا
یہ چمک اسکے تھی دندانِ مصفیٰ کی دلا!
سامنے جس کے درخشاں کبھی اختر نہ ہُوا
چاہیے تھا دل کہ خریدار ہو گلرویوں کا
گانٹھ میں غنچہ کی مانند ولے زر نہ ہُوا
نرگس آنکھوں کی نہ ہم چشم ہُوئی گیا یارو
رشکِ رُوئے صنم لالہ احمر نہ ہُوا۔
بے طرح چیں بجبیں شوخ تھا کل اے عاصی!
خیر گذری، کہ میاں ہاتھ میں خنجر نہ ہُوا۔

زلف کے سُلجھانے سے واں شانہ کا کیا جائے تھا

یاں پریشاں خاطروں کا حال بگڑا جائے تھا
جبکہ اپنے پاس سے وہ ماہ وش اُٹھ جائے تھا
پھر دل اپنا ہمدم ہو گیا سخت گھبرا جائے تھا
ضعف سے دل کی یہ حالت تھی کہ ہر ہر گام پر
مثلِ نقشِ پا تیرے کوچے میں بیٹھا جائے تھا
گر نہ ہوتا رات کو وہ ماہوش جلوہ کناں
ہمنشیں پھر بزم میں کیا ہم سے ٹھہرا جائے تھا
کوئی دن ٹھہرا تیرے آنے سے یہ دنیا میں پھر
ورنہ اس رنجور کا جی آہ! نکلا جائے تھا
آج جو دیکھا، تو اے مردم وہ دلبر راہ میں
دیکھ کر عاصی کو کچھ آنکھیں چُراتا جائے تھا

رات دن ہجر میں بیتاب دلِ زار رہا،
اور اے وائے تو دیتا مجھے آزار رہا
کیا دلا دامِ بلا میں تو گرفتار رہا،
عشقِ زلف آخرکار آہ تجھے مار رہا
اور کچھ کام نہ کلُو مجھے زنہار رہا،
عشق تیرا ہی گلے کا مرے بس ہار رہا
گذری ایک عمر مجھے نالۂ شبگیر کے ساتھ
پر کبھی شب کو تو پہلو میں نہ دلدار رہا،
سنگِ دل نے نہ ذرا روزن در سے جھانکا
بیٹھا میں صبح سے شب تک پسِ دیوار رہا
شوق سے جائے جہاں چاہے دل اُس کا یا رو

ساتھ اسکے مجھے اب کچھ نہ سرو کار رہا
جب سے دیوانہ ہُوا رشکِ چمن کا عاصی
تب سے کچھ دل میں نہ شوقِ گل و گلزار رہا

لبوں کا تیرے بوسہ جبکہ صبح و شام لیتا تھا
نبات و قند کا تب میں نہ ہرگز نام لیتا تھا
بھلا قاصد سے کس دن خطِ بُتِ گلفام لیتا تھا
نہ خط آیا تھا جب تک کب وہ میرا نام لیتا تھا
تیرے صدقے خدا کے واسطے کہدے کہاں شب کو
بلائیں کون تیری اے بُتِ خود کام لیتا تھا
لگا کانوں سے تیرے کوئی سننے نہیں دیتا
تو ورنہ گوشِ دل سے سن میرا پیغام لیتا تھا
نہ تھا کچھ پاس اس عاصی کے سیمیں تن سے یہ کہدو
تجھے دیتا تھا جب زر جب کسی سے وام[1] لیتا تھا

جب سے پہلو سے جُدا میرے وہ ہمدم ہو گیا
پھر تو روزِ عید یاں شامِ محرم ہو گیا
کیا پریشاں یہ دلِ پُر محنت و غم ہو گیا
زلف کے یاں دھیان میں سب کام برہم ہو گیا
ابرِ گوہر بار کی پھر جھڑ گئی شیخی تمام
جب کہ اسکے سامنے یہ دیدۂ پُرنم ہو گیا
کہہ گئے دل کو قرار و صبر و آرام الوداع
ہمنشینوں یاں سے رخصت یار جس دم ہو گیا

[1] وام۔ قرض

تیرے آنے سے مرا افزوں ہُوا عزّ و وقار
قدر و شوکت سے تیری ہاں کچھ نہیں کم ہو گیا
بن گیا سودائی اے یار و نہ یہ عاصی فقط
دیکھکر دیوانہ اس کو ایک عالم ہو گیا

زنجیر میں پابند دلا تو نظر آیا
یعنی کہ اسیرِ خمِ گیسو نظر آیا
غنچہ کی طرح تنگ ہُوا جی سے دلِ زار
جب اپنی نہ آغوش میں گلرو نظر آیا
دیکھی وہ جبیں ماہِ منور سے درخشاں
اور مہر کے رُوکش رُخِ نیکو نظر آیا
قمری کو وہیں سرو کی بس یاد گئی بھول
جب یار کا میرے قدِ دلجو نظر آیا
گالی کے سوا منہ سے نکلتا نہیں تیرے
اے شوخ! قیامت ہے تو بدخو نظر آیا
آگے کا میرے قصد تھا ہرگز نہ اٹھا پاؤں
واں سے کہ جہاں تیرا سرِ کو نظر آیا
آرام نہ پایا دلِ بیتاب نے عاصی
دلبر سے جدا شب کو جو پہلو نظر آیا

مہرِ تابندہ تابش نے اور قمر دکھلا دیا
طور کی تجلی سے نہ لیکن خوب تر دکھلا دیا
رُخ نے اس کی زلف کا کوچہ سحر دکھلا دیا

رات کو لیکن تو اے داغِ جگر دکھلا، دیا[۱]

دیکھ اپنی صورتِ زیبا ہُوا مغرور تو،
آئینہ کس نے تجھے اے سیمبر دکھلا دیا

خاکِ رہ میں ہو کے واں اُڑ کر پہنچتا اے صبا
تو نے گر ہوتا مجھے گلرو کا گھر دکھلا دیا

ہوشِ بلبل کے اُڑے عاصی مرے گلرو نے جب
عارضِ رنگیں چمن میں آن کر دکھلا دیا

زلف اُٹھا کر مُنہ جو اے رشکِ قمر دکھلا
شام ہی کو تو نے بس نورِ سحر دکھلا دیا

سر کٹا یا، پھر دوبارہ تن پہ سر دکھلا دیا
شمع نے شب شعلہ رُو اپنا ہنر دکھلا دیا

وہ کشیدہ تھا بہت پر کھینچ ہی لایا اُسے
جذبۂ دل نے ہمیں اپنا اثر دکھلا دیا

فتنۂ محشر سنا کرتے تھے کانوں سے، مگر
تو نے آنکھوں سے ہمیں اے فتنہ گر دکھلا دیا

کچھ خطا تیری نہیں ہے میری قسمت کا لکھا
خط جو تو نے غیر کو اے نامہ بر دکھلا دیا

اس دلِ پُر داغِ غم کو تیغ سے کر کر دو نیم
عاصی کل اُس شوخ نے شق القمر دکھلا دیا

ہمکو چشمِ تر نے رونے کا ثمر دکھلا دیا
جو گرایا اشک مژگاں سے گہر دکھلا دیا

[۱] چراغ

شام ہجر آئی تو اس نے سوئے سر دکھلا دیا
چھائی صبحِ غسم تو بالی کا گہنہ[1] دکھلا دیا
ضبطِ گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا
چشم کے کوزہ میں دریا بند کر دکھلا دیا
پوچھا اُس گل نے جب آکر سینۂ سوزاں کا حال
داغِ دل دکھلا دیا، داغِ جگر دکھلا دیا
صبر و طاقت، دین و ایماں، جان و دل چھوڑ ایک ایک
کس فرشتہ کو ہے تم نے لا کے گھر دکھلا دیا
دل سیہ ہے بال سب ہوتے چلے عاصی سپید
اِس اندھیرے میں تو پیری[2] سحر دکھلا دیا

بہت مغرور تھا اپنے وفورِ جوش میں دریا
تھپیڑے موج کے کھائے تو آیا ہوش میں دریا
تپِ لرزہ نہ اُترے تیرے بیمارِ محبت کی
پسینہ سے اگر بہ جائے بالاپوش[3] میں دریا
حباب اسکو بھر گرداب مت سمجھو کہ پہنے ہے،
میرے گریہ سے قائل ہو کے کوڑی گوش میں دریا
ستم ہے میں ہوں عین وصل میں ناکام جوں ساحل
کہ لب ہیں خشک میرے اور ہے آغوش میں دریا

---

[1] ناچ میں بتاوا اور بھاؤ بتانے کی طرف اشارہ ہے
[2] چراغ
[3] لحاف
[4] ارمان کے

نہ کیوں مست ہئے ناز اپنا جاوے سیوہِ ریا کو
بھلا لگتا ہے عاصی دیدۂ مینوش میں دریا

لے گیا دل کو پھر اک شوخ طرحدار نیا
بیٹھے بٹھلائے لگا جان کو آزار نیا
ہوتا انکار ہے اُس شوخ کا اقرار نیا
وعدۂ وصل ہے قسمت مری ہر بار نیا
نخلِ مژگاں میں پھلے لختِ جگر اور آنسو
خانہ چشم میں ہے جوہری بازار نیا

قطعہ

ابرِ بہمن ہو جیسے دیکھ کے پانی پانی،
تارِ گریہ وہ لگا چشمِ گہر بار نیا
تامرے اشکِ مسلسل کی بدولت دیکھیں،
مردماں بیش بہا موتیوں کا ہار نیا

بوسہ مانگا تو بصد ناز جھڑک کر بولے
ایسا رکھتے نہیں ہر ایک سے ہم پیار نیا
دُختِ رز پردۂ مینا سے لڑاتی ہے جو آنکھ
شاید آپہنچا ہے تہا کوئی میخوار نیا

متفرق اشعار

باقی رہا تھا ایک یہ دل سو بھی کھو چکا
یہ بھی لکھا کلام کا ہونا تھا ہو چکا

جُوں نقشِ قدم ضعف نے تو مجھکو مٹایا
چل بیٹھ صبا تو نے بھی آکر نہ اُٹھایا

گِردِ خور کے پھر نہ ہرگز ایک دن ہالہ بنا
جب سے میری یہ جبیں گِھسے کان کا بالا بنا
تک لبِ بام آ کے تو بھی دیکھ اے لیلیٰ منش
صورتِ مجنوں ہے تیرا چاہنے والا بنا

مہر اک ذرّہ ہے اُس کے عارضِ پر نور کا
ماہ بھی شعلہ سا ہے لیکن چراغِ دُور کا
ہے وفورِ حُسن سے عالم یہ اُس مغرور کا
آدمی کے جسم پر گویا ہے چہرہ حُور کا

دل کو عاصی نے نثارِ بُتِ خود کام کیا
حاصلِ عمر یہی تھا سو بڑا کام کیا

مرغِ دل صید تجھے تیرِ نگہ کر ہی رہا
نہ بچا پر نہ بچے ایسا پھنسا مر ہی رہا

قصیدہ

آج ہے وہ روزِ عشرت آج ہے دن عید کا
ہوتے ہیں اکثر بغل گیر آشنا سے آشنا
عید ہے گھر دوستوں کے جاتے ہیں ملنے کو دوست
ہے یہی رسمِ محبت ، ہے یہی راہِ وفا
ہاں چنانچہ ایک میرے بھی شفیق و مہرباں
یارِ جانی، دوست صادق اور محبّ باصفا
آئے میرے گھر وہ اور احوال میرا دیکھ کر
دیر تک حیراں رہے وربعد حسرت یہ کہا
تو بھی عاصی اب تلک وہ ہی پریشاں حال ہے
وہ ہی اک کہنہ دوشالہ وہ ہی اک کہنہ قبا
وہ ہی اک بالو کہ ایڑوں سے نہیں چلتا قدم
ہر قدم پر ہے مٹ جانا برنگِ نقشِ پا
بلکہ اکثر تو پیادہ خاک سے آزردہ پا،
چاندنی[1] پر پاؤں سے دیتا ہے چھاپے جا بجا
تیرا یہ حال اور تو نواب صاحب کا قدیم
دوستدار و خاکسار و خاکِ راہ و خاکِ پا
کونسی خدمت گذاری میں ہُوا تجھ سے قصور،
کونسا وہ حکم تھا جو تو نہیں لایا بجا
کیا کچھ اس کے دشمنوں سے تو نے کی ہے دوستی
یا کچھ اسکے مدعی سے تو نے چاہا مدعا

[1] سفید چادر فرشی

یا کہ کچھ غائب میں اس کے تو نے غیبت کی کہیں
یا کہ تو اس کی حضوری میں نہیں حاضر رہا
پھر جو ہے کم التفاتی اس قدر، یہ کیا سبب
کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر، کیا تیری خطا
جب کوئی کہتا تھا تجھ سے چل دکن کی سیر کو
تاؤ تو مونچھوں کو دے کر کہہ رہا تھا برملا
ہوگئی نواب کی جس دن ترقی خوب سی
دیکھنا میرے لئے اس دن یہیں ہوتا ہے کیا
سو وہ دن اب تو ہوئے رہے۔ خدا کے فضل سے
پر خدا نے رہا تیرے لئے دن کونسا
جانتا ہے وہ کہ تو نے اپنا نسکر شعر میں
اس قدر لہو پیا قطرہ نہیں خوں کا رہا
تیری محنت پر بھی کیا اس کی نہ ہووے گی نگاہ
تیری محنت پر بھی کیا اس کا نہ دل خوش ہوئیگا
اسکو سلطاں نے کیا ہے آج رکن سلطنت
تیرے دینے کے لئے ہاتھ اسکا کیوں رکنے لگا
اور یہ بھی جانتا ہے۔ ہیں جو شاعر پیشہ لوگ
اگلے نوابوں نے بھی کیا کیا سلوک ان سے کیا
اور تو شاعر بھی ایسا جس کا شہرہ شہر میں
ہو رہا ہے کو بکو، خانہ بخانہ، جابجا
آشنا تیرے ہزاروں اور لاکھوں تیرے دوست
جو ملے گا تجھ سے، یہ پوچھے گا تجھ سے کیا ملا

کیا ہُوا انعام تجھکو، تو نے کیا پایا صِلا
کیا ہوئی تنخواہ تیری، کیا ترا منصب بڑھا
تو نہ بتلائیگا تو ہوں گے مکدّر دل میں وہ،
اور بتلائے گا تو ان کو نہ باور آئے گا
ہم نے مانا تو ہے اک درویش خو قانع مزاج،
جو میسر آیا کھایا، اور کیا شکرِ خدا
پر یہ خلقت پوچھنے دانی نہ تجنے گی تجھے،
جس طرح ہو جان اپنی اُن کے ہاتھوں سے بچا
جلد کر تو اب سے احوال اپنا جا کے عرض،
اور یہ جو کچھ حقیقت ہے وہ سب اسکو بتا
پہلے خالق نے بنایا اس کو دریائے کرم،
پھر کرم سے اپنے کی طغیانی دولت عطا
آگے بھی نوجوں کے بیڑوں میں رواں تھا اسکا فیض
اب بھی جس دم لہر آئے دے گا دریا ہی بہا
جب سنے اس آشنا کے منہ سے اس نے یہ کلام
بس تو ہیں خدمت میں تیری کہہ کے یہ حاضر ہوا!
بحر دبر میں جھاڑ دے دامن اگر تو فیض کا
قطرہ دُرِّ بے بہا ہو سنگ لالِ بے بہا
ہاتھ پکڑے جس کا تو ہاتھ آئے اسکے دستِ غیب
جس کو چٹکی خاک کی دے ہو وہ صاحب کیمیا
تو وہ دانا تیری دانائی کی داناے فرنگ
داد دیتے ہیں کہ ہاں اے آفریں اے مرحبا
تجھکو شاہنشاہِ دوراں اپنا فرزندِ لیق

کہہ چکا ہے۔ واہ وا تیری لیاقت واہ وا
پائے آرائش جو عالی شان مکاں دیوان عام
کیوں نہ پائیں تجھکو عالی شان عالی حوصلہ
ہوشیاری کا جہاں لشکر ہے سر لشکر ہے تو
خیر خواہی کا جہاں رستہ ہے تو ہے رہنما
بخت کھاتے ہیں سدا اقبال کی تیرے قسم
کرتا ہے اقبال تیری عقل کی دائم ثنا
کوئی کیسا ہی بڑا طرار و خوش تقریر ہو
مات ہو جائے جو تو پوچھے جواب اک بات کا
دوستدار ملک و دولت خواہ شاہ دیں پناہ
ہوشیار و عرد آخر ہیں ، امیر و پارسا
دیکھتے ہیں ہم وہی بے ساختہ تیرا عمل
علم سے جو عالموں نے ہے کتابوں میں لکھا
کیا کہوں تعریف تیری ، ہے بہری تا عر زباں
ایک تیرے حق میں ہے یہ وہیدم دل سے دعا
عید ہو تجھکو مبارک اور ہو دولت فزوں
اور بدولت تیری ، میرا بھی بر آوے مدعا
نام ہو ملکوں میں تیرا اور تیرے مداح کا
مدعا عاصی کے دل کا جلد بر لاوے خدا

قطعہ

جو بحضور خدیو گیہاں معین الدین اکبر بادشاہ پیش کیا، اور صفحہ میں

دوشالہ بلا :-

زاغِ ظلمت نے کہا اور ہے کمبل کب کا
اور بگلا بھی ہے گالے میں روئی کے دبکا
کر کرم مجھ پہ ذرا مہرِ سپہر تمولی !
ورنہ سردی کی ہوا نے مرے دل کو ہبکا

غزل فارسی

گذر افتد اگر در کعبہ ام آں شاہ خوباں را
نثارِ ہر قدم سازم دل و جاں دین و ایماں را
چساں بندم بہ سنے بستِ مژہ آں چشم گریاں را
کہ بستِ راہ نتواند شدن خس جوشش طوفاں را
کسے گر بشنود زاں لب سخنہائے تو شیریں
چو اسکندر بجز کے در نیارد آبِ حیواں را
بہ بزمم احتیاجِ شمع افسردوزی کے باشد
بقندیلِ فلک دارم چراغِ ماہِ تاباں را
مریضِ عشق آں بے درد بنبضِ مردہ دارد
کہ جائے نبض ماتم سازد انگشتِ طبیباں را
چہ باک از تلخی گردوں کہ با من بسبب دارد
گوارا تر بود تلخی مذاقِ بادہ نوشاں را
نزاید داغہائے سینہ عاصی گر دریں گلشن
ضیا ابتر کند یکدست اوراقِ گلستاں را

نذرِ تہنیت

بونصر اکبر حسین الدین
خالق الارض خسروِ بادداد
اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر
کہ شدہ عدل و داد ازو ایجاد
آفتابِ سپہرِ تیموری
جلوہ گر گشت بر سریرِ مراد
عادلِ عہد، شاہِ ہفت اقلیم
غسلِ صحت چو کرد با دلِ شاد
بہرِ جشنِ طرب نشاط افزا
صحنِ دل پر از غیب شد ایجاد
ہاتفے گفت از سرِ راحت
شاہِ اکبر ہمیشہ قائم باد
طبعِ عاصی برائے نذر آورد
شعرِ تہنیت و مبارکباد

۱۳۲۷ھ

مخمس

بر غزلِ شہیدی

وہاں سہرا میں سر سے پردۂ عذب البیان باندھا
یہاں تُونے بھی سے کہ مرغِ روحِ ناتواں باندھا
ہنسا یا برق ساں دانتوں کو بحرِ خوں چکاں باندھا
لب جو کس نے ایسے رشکِ پری ایسا سماں باندھا
کہ تو نے دو ترانے گائے اور آبِ رواں باندھا
خیالِ کمر پہ شب آنکھوں نے وہ کچھ عروماں باندھا
کہ اشکوں نے گرہ میں حاصلِ صد بحر و کاں باندھا
کھلا سب اس پہ عقدہ داستے قسمت جو نہاں باندھا

تصوّر عاشقِ بیداد نے جب دل میں یاں باندھا
نقاب اس شرمگیں نے اپنے چہرے پر عیاں باندھا

تپ سوزِ درونِ دل سے بن میں ہم جل بھن کے جا بیٹھے
جٹا سر پر رکھی چہرے پہ خاکستر لگا بیٹھے
غرض تفقیدہ حال وہ تھے، ستم اُٹھے، بلا بیٹھے
ہما کے پر جلیں، اگر استخواں میری پہ آ بیٹھے
وہ مجنوں تھا کہ سر پہ طائروں نے آشیاں باندھا

چمن میں بار ہے گُل کو نہ شبنم کو رسائی ہے
کلی کو بے کلی، باد صبا کو جاں گزائی ہے
خزاں نے آنکھ اپنی آتے ہی دن سے لگائی ہے
زمیں بیں کے دل پہ بے ثباتی گُل کی چھائی ہے
نہ باغِ خلد میں بھی اُجڑنے جا کر آشیاں باندھا

لکھوں کلکِ بیاں سے وصفِ خطِ سر خواہ نالہ کے
کہ پیغامِ زبانی اس کو بھیجوں براہ نالہ کے
نہ کیوں قربان ہو جاؤں میں اپنے آہ نالہ کے
گیا عرشِ بریں پر دل میرا ہمراہ نالہ کے
تماشا دیکھ اس تن سے دل کو میں نے کہاں باندھا

وہ جوڑا جب مجھے مشتِ شبِ یلدا دکھاتا ہے
تو عاصی عقدۂ سربستہ اس کا یاد آتا ہے
عدم کی راہ سے نکلے ہے جو آنسو گراتا ہے
شہیدی کثرتِ عصیاں سے مجھ کو خوف آتا ہے
سفر ہے دور کا اور دوش پر بارِ گراں باندھا

مخمس

بچشمِ دل جو خوابِ دولتِ بیدار ہو پیدا
تو پھر خالِ ذقنِ یوسف نمط اک بار ہو پیدا
زلیخائے صفائے دل میں شوقِ دیدار ہو پیدا
تماشا ہے اگر آئینۂ سینہ تو نگاہ کو ہو پیدا
تحیر سے مثالِ نقش تو مئے دیدار ہو پیدا

ہوا ہوشی ہی خوشبوئے ہمزہ جولیتے ہیں اب تیرے
کشش باغِ نزاکت میں زرِ گل دیکھ لب تیرے
ضیا لب بامِ عارض ہے مہِ خورشید شب تیرے
کھلے جیبِ تمنا سے تمکش یاقوت جب تیرے
گریباں سحر سے مطلعِ انوار ہو پیدا

تجھے اے مردمِ چشمِ تحیر کیونکہ حجت دیا
نہ جب تک رازِ پنہاں پردۂ الفت میں کھلائیں
غبار آئینہ کو نوکِ مژگاں پر جو بھر لاویں
تو پھر اس دل کی وحشت سے کئی منصور بن جاویں
انا الحق کا کروں دعویٰ تو سو سو دار ہو پیدا

کروں گلزارِ عشقِ وحدتِ راز ہے گر پہ سینہ میں
لگائے بام سے پر غفلتِ ہستی کے زینہ میں
بنوں اشراف اس پل یا دلِ وحشی کے کینہ میں
نہ چھوڑوں ایک قطرہ مے کا باقی جام مینا میں
جو مے خانہ میں وحدت کے کوئی میخوار ہو پیدا

ہٹا کر جیب کھڑا ہو بام پر وہ آفتابِ دوراں

دکھا دے خضرِ دل کو شامِ غم سے چشمۂ حیواں
سراپا حسن و خوبی ہے تو اپنے فن میں اے جاناں
جھلکے بالوں میں یوں چمکے ترے آویزۂ رخشاں
کہ جوں ابرِ سیہ میں برق سو سو بار ہو پیدا

ہوئے گو نام کو فرہاد و مجنوں وامق و عذرا
کوئی بھی دل لگا اس بے وفا سے فیض کو پہنچا
رہِ غم میں پڑے پھرتے رہے شوریدہ سر رسوا
تڑپتی ہے تو کیوں بلبل کمال اتنا تو کر پیدا
گرے جس جا پہ اشک اپنا، وہیں گلزار ہو پیدا

مریضِ دردِ غم وہ ہوں دوا جو دو ضرر ہو وے
نہ جب تک وہ مسیحا آ کے عاصی چارہ گر ہو وے
کروں نالہ تو شاید اس کے دل میں کچھ اثر ہو وے
جسے کچھ نقطۂ تحقیق سے قدرا سے خبر ہو وے
اُسی کے دل میں عشقِ حیدرِ کرار ہو پیدا

مخمس

بر غزل اختر

سایہ پڑے جو عکسِ رُخِ مہر تاب کا
ہر سنگ میں شرر ہو جگر لعلِ ناب کا
پُر از گہر ہو بحر میں ساغر حباب کا
جب پردہ رُخ سے دُور کرے وہ نقاب کا
جادہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

محفل میں ایک رندِ سبو کش نے آ کہا
ٹھہرا ہے صبح یہ ہی ان سب کا مشورہ
جس ڈھب بنے تو بادۂ غفلت اُسے پلا
کل شیخ بن کے مجتہدِ عصر سا قیا
دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا

دیکھا جو سبتلائے تفکر مجھے بطنز
پایا تفریقِ بحرِ تحیر مجھے بطنز
بہلا کے زیرِ دامِ تکبر سبھے بطنز
کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے بطنز
معلوم ہو گا حشر کو پینا شراب کا

ناحق گماں کذب ہیں ہو مجھ کو سا سنتے
کچھ جھوٹ دیکھتے ہو، نہ ہو بات چھانتے
فرمائیے وہ کیا نہیں ہم بات مانتے
میں نے کہا، کہ ہم بھی ہیں یہ خوب جانتے
پر کیا کریں، کہ ہے ابھی عالم شباب کا

جاناں غمِ فراق سے چپ کب تک رہوں
کب تک نہ حالِ دردِ دلِ ناتواں کہوں
اس میں خوشی ہو آپ کی یا خاطرِ زبوں
تقصیر ہو معاف تو ایک عرض میں کروں
مجھ کو اگر نہ کیجئے مورد عتاب کا

جب تک نہ دے صفائی باطن خدا درست
کب زہد اُن کا رکھتے ہیں شاہ و گدا درست
ہے زہد بلکہ آپ کا ہی قبلہ نا درست

تقوے ہمارے آگئے ہو جب آپ کا ورت
اور تب یقین ہو آپ کے اس اجتناب کا

گلشن ہو، گل ہو، ابر ہو، ہو، ہو، سرخ جرعہ کش
اس دورِ انجمن پہ نہ کیوں ہو دل اپنا غش
دیکھو بچشم غور تو تم بھی کرو عش عش
مے اور تمنج باغ ہو، ساقی ہو حور وش
اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

جادو فریب، عشوہ نما، طرفہ مہ لقا
شب دفعتہً جو حالتِ مستی میں آگیا
سینہ سے سینہ لب سے لب اور منہ سے مُنہ ملا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ مرتقا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

صبر و قرار لے گیا دل سے لگا کے مُنہ
آئینہ وار کر گیا حیراں دکھا کے مُنہ
جب بیٹھے چپکے ہم، تو کہا یہ بنا کے مُنہ
کھینچے ہنسی سے اسکو وہ منہ سے بلا کے مُنہ
یہ ریش جس میں جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

جتنے کہ عذر و حیلہ تھے ہم نے سبھی کئے
اس شوخ نے نہ مانا رہا جام مے لئے
کس طرح اس کے ہاتھ سے یارب کوئی جئے
منت سے یوں کہے ہا کہ تمہارا ہو پئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

جلسہ میں جب کہ دیکھئے طبلہ کی تھاپ کو

پریوں کے منہ سے سنئے مزے کے الاپ کو
ممکن نہیں دل نہ چاہے صنم کے ملاپ کو
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر آپ خوف کیجئے روز حساب کا

احوال کچھ نہ پوچھ تو اسے شوخ لالہ فام
صہبا کے عشق میں ہے مجھے خواب و خور حرام
آتا نہیں ہے اس کے سوا اور کچھ کلام
پر انتقال بنیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کبھی شیخ و شاب کا

جب التفات ہو نہ تلطف نہ وہ تپاک
عاصی نہ کس طرح سے کرے جیب صبر چاک
اور یہ تمنا ہے اسکی بحق رسول پاک
یارب غم فراق میں اختر ہو جب کہ خاک
سایہ ملے اسے قدم بو تراب کا

عیدی دسہرہ

(مسدس ترجیع بند۔ غیر منقوطہ)

گاؤ کدا ادا ، مالک کس طور کمک کا دو دکھا
عطر سہاگ کا ملو ، لاؤ عروس مدعا
مدح کا مطلع دگر لکھو عطارد سہا
گرم رہ سلوک ہو سلسلہ مہر کا ہلا
مہر کہو اسوا ہو ، ماہ کہو اعطا اعطا

دو وہ دعا دمِ سحر اسکو دہر ہو سدا

لالہ کھِلا وہ سبزہ اُگا چمن وہ زار گدگدا
دردِ الم ہوا ہوا اسیر دہوا کا لپکا کھا
رعد کا مور کوک کر طُرّۂ گُل رہا لگا
وسوسۂ دعا دل جو مٹا ہوا ہوا
مہر کہو اُبھر اُبھر، ماہ کہو اٹھا اٹھا
دو وہ دعا دمِ سحر اسکو دہر ہو سدا

گو کہ ہو جیں دل سدا م نکاتِ صلاح کا سرور
صلی اللہ محمد آگیا، کہ ہو درد دل کا قدر
مسودۂ درد کو مدرکہ ہوا سیں خور
للہ الحمد ہو سطا لمعۂ سلکیت کوہِ طور
مہر کہو اُبھر اُبھر، ماہ کہو اٹھا اٹھا
دو وہ دعا دمِ سحر اسکو دہرہ ہو سدا

کاسۂ دل کا دور ہو اور ہو سایۂ رو کھڑا
معرکۂ درد اور دل محمل وہ اسکا واہ وا
گلکدہ سا بنا ہنسا، کار برنج و غم ملا
طرح ادا کمال کرم لعل و گہر الگ دھرا
مہر کہو اُبھر اُبھر، ماہ کہو اٹھا اٹھا
دو وہ دعا دمِ سحر اسکو دہرہ ہو سدا

لطمہ ہو ابر کو بہار جو بزم مراد دل
دلولۂ وصال گُل وسوسہ و حواس ہل
مہر دکرم کا کھول در لاد اگر سوال عمل
اسکو دمِ کرم دوم عاصی سدا طیلہ دو گل

پھر کہو اہو اہو لے آہ کہو اہا اہا
دہ دہ دُعا دم تحسر اسکو دہرہ ہو سدا

ردیف ب

گل نکے سنے جو فریاد و فغانِ عندلیب
کس کی سنتا ہے، کہ پھر روکے زبانِ عندلیب
مت اُجاڑو تم چمن سے آشیانِ عندلیب
رہنے دو اسے باغباں تک نشانِ عندلیب
جلد پہنچا یہ خبر تک گوشِ گل تک اے صبا
ہائے جاتی مفت ہے برباد جانِ عندلیب
مثلِ گل ہے سینہ چاک اور دیدہ چوں شبنم ہیں تر
بن ترے نالہ کناں دل ہے بسانِ عندلیب
کچھ نہیں پروا ہے عاشق کی دلِ معشوق کو
کیا عجب سنتا نہیں گل داستانِ عندلیب
کس قدر صیاد کے دام میں تڑپے ہے ہائے
کیا کروں تجھ سے میں اے عاصی بیانِ عندلیب

بن اسکے ذرا کل مجھے، ہیہات نہیں اب
جس سے کہ میری آہ ملاقات نہیں اب
پہلے تھی جو اس شوخ میں وہ بات نہیں اب
جو آگے وہ تھی سو ملاقات نہیں اب

کس طرح یقین مجھے آئے تیرا قاصد
اس خط سے تو کچھ حرف حکایات نہیں اب
اُس کی نگہِ لطف وہی ہے طرفِ غیر
پر ہم پہ فقط چشمِ عنایات نہیں اب
شب میں نے کہا جبکہ نہ جاؤ ابھی ہے رات
زلفوں کو اُٹھا کر یہ کہا رات نہیں اب
ہر لحظہ غم و رنج ہے اک یہ ہی خوشی ہے
بن آپ کے ہوتی بسر اوقات نہیں اب
عاصی کی شب و روز جو گریاں رہیں آنکھیں
پھر کون بھلا کہو سے کہ برسات نہیں اب

ہجر سے تیرے نہیں کیا دل بیتاب میں تاب
بیقراری سے نہیں دیدۂ بے خواب میں خواب
گر اُٹھا دے رُخِ تابندہ سے تو اپنے نقاب
ذرا باقی نہ رہے مہرِ جہاں تاب میں تاب
جوں کسی ڈوبے کا دریا میں نہ ہو تختہ بڑا
بحرِ اُلفت نے لیا یوں مجھے گرداب میں داب
اب کی ہچکی ہی گئے ساتھ اپنی تو ہے جان ہوا
ہم ذرا اب نہیں باقی دل بیتاب میں تاب
قدر اس کی نہ ہو کس طرح سے کہ اپنا آنسو
رکھتا موتی کی سی ہے دیدۂ پرآب میں آب
آ گئے اُس غیرتِ گل کے مری اے بادِ صبا
پڑھ گلستاں کا کوئی محفلِ احباب میں باب

اس کی تعبیر کہوں تجھ سے میں کیا اے عاؔصی
آیا جیسے ڈھب ہے نظر آج تجھے خواب میں خواب

ردیف پ

نہ یہ اُڑن، نہ یہ دھامن نہ ہے یہ نیلا سانپ
کہ ہے یہ زلفِ گرہ گیر کا گٹھیلا سانپ

صنم کی زلف کو لے ہاتھ میں یہ دل نے کہا
کہ میں بھی آیا ہی بلا ہوں جو اب یہ کیلا سانپ

نہیں ہے آپ کا بافِ سرخ سانپ سے کم
بجا ہے اسکو اگر کہئے ہاں رنگیلا سانپ

ڈرانا کیا ہے تو لکڑی کے سانپ سے ظالم
جو من ہیں تیرے یہ آیا ہے، تو کو یلا سانپ

پڑا جو نوڑے کا سونے کے عکس دریا میں
تو بن گئی وہیں ہر موجِ آب پیلا سانپ

یہ دیکھکر وہ بُت شوخ یُوں لگا کہنے
پھپا ورا ہے یہ پانی کا یا مٹیلا سانپ

بدل کے قافیہ اک اور لکھے غزل عاؔصی
دلیک بیٹھے کسی شعر میں نہ ڈھیلا سانپ

بڑی بلا ہے وہ کاکل کا ہائے کالا سانپ
دلا نہ چھیڑ، یہ کاڈں سے ہے نرالا سانپ

ہ سانپ کی قسمیں

تمہاری زلف کا سانپوں سے ہے نرالا سانپ
کہیں بھی اس سے نہ نکلا کوئی دوبالا سانپ

بھرا ہوا کوئی ایسا ہی زہر کا ہو لا سا نپ
کہ جسکو دیکھ کے سب بھول جائیں کالا سانپ

کوئی جہان میں کاٹا ہوا نہ جس کا جیا
وہ قہر آپ نے جعدِ سیہ کا پالا سانپ

ازار بند وہ حبالی کا دیکھ پیچ دلنے کا
یہ سمجھا دل کہ دوموہاں ہے کوڑیالا سانپ

زمیں پہ پھینک کے گنڈا گلے کا اپنے سیاہ
لگے وہ کہنے یہ شب مجھ سے جا اٹھا لا سانپ

چمکتا کان کا ہوتی ہے زلفِ پیچاں میں
نکالے بیٹھا ہے یا اپنا منکا[1] کالا سانپ

عجب طرح کا ہے عاصی یہ مطلع منشی[2]
کہ اور قافیہ میں دیکھ ہے نکالا سانپ

فلک کے بام پہ چڑھتا ہے کب زمیں کا سانپ
پر اڑ کے پہنچے ہے اس آہ آتشیں کا سانپ

ردیف ت

پیتا تھا بزمِ غیر میں دلبر شراب رات
اور دل تھا اپنا آتشِ غم سے کباب رات

۱؎ ہیرا جو بعض سانپوں کے منہ میں ہوتا ہے۔ ۲؎ منشی مول چند المتخلص بہ منشی قوم کایستھ ماتھر سکنہ دہلی۔ شاگرد جناب شاہ نصیر۔ آپ بھی شاہ عالم کے دربار میں عہدہ جلیلہ پر ممتاز تھے۔ شاہنامہ فردوسی اور شمشیر زنی کو اردو میں نظم کیا ہے۔ رسالہ نامہ منظوم کے بھی مصنف ہیں۔ ۱۲۳۲ھ میں انتقال فرمایا۔

آنا نہ بزم میں وہ پریرو اگر، تو پھر
اُڑ جاتے آہ دل سے مرے صبر و تاب رات
فرمایئے، وہ کون تھا؟ جاتے تھے جس کے ساتھ
مُنہ کو چھپائے آپ بزیرِ نقاب رات
جانے کا قصد کر نہ خدا کے لئے ابھی،
باقی ہے دیکھ اے بُتِ خانہ خراب رات

قطعہ

بِن تیرے کیا کہوں، کہ بسر کس طرح ہُوئی
اے دلربائے رشکِ ومہ آفتاب رات
تارے گِنا کیا میں بہ تنہا میئے سحر
گوہر فشاں رہی مری چشمِ پُرآب رات
عاصیؔ کے دل کو تاب ہے دن کو نہ زینہار
نے چشمِ تر کو ہے غمِ فرقت سے خواب رات

پھُولی ہے گو ہزار اِدھر اور اُدھر بسنت،
پر بِن ترے ہے خار مجھے سر بسر بسنت
آئے جو بالباس بسنتی تو سامنے،
سرسبز پھر ذرا بھی نہ ہو سیم بر بسنت
واں، تو ہے سُرخ پوش، یہاں میں ہوں زرد رنگ
واں ہولی تیرے گھر ہے یہاں میرے گھر بسنت

قطعہ

دامانِ کوہسار میں، یا گلستان میں
دیکھیں ہیں ہم جدھر تو پڑے ہے نظر بسنت

پھر کیا عجب ہے اے دلِ شیدا جو بلبلیں
گاویں ہزار شوق سے شام و سحر بسنت

گر جستجو کسی کی نہیں ہے تو عاصی اب
پھرتی ہے کس لئے یہ بھلا در بدر بسنت

نہ کیونکر راہ دیوے دل میں اس گمراہ کی صورت
لبِ خاتمش مہ تو ہے ، ذقن ہے چاہ کی صورت

ردیف ج

بیٹھا ہے کیا تو کر کے صنم در کو بند آج
در پر ترے کھڑا ہے کوئی دردمند آج
رخشندہ مہ سے رُخ ہے ترا چار چند آج
دُور آپ کو تو کھینچے ہے کیوں خود پسند آج
کھینچوں نہ کیونکر آہ ، کہ ناگاہ ہو گیا ،
پابندِ دامِ زلف دلِ مستمند آج
میری فغان و نالہ سے برپا ہے شورِ حشر
رُوئے زمیں سے تا بسرِ چرخِ بلند آج

قطعہ

بیٹھوں ہوں گاہ ، گاہ قلق سے اُٹھوں ہوں میں
اور دل ہے بیقرار مرا جیوں سپند آج

ہے یہ خطر کہ گرمیٔ آتش سے ہجر کی
پہنچے کہیں نہ جانِ حزیں پر گزند آج

عاصی یہ کہدے اس سے کہ دامن تلک ترا
ہے جیب چاک، ٹوٹے قبا کے ہیں بند آج

کون کہتا گردِ سر کے مہ جبیں ہالہ ہے آج
کان کا بالا ترے کاکل سے کیا نکلا ہے آج
سچ بتا دینا اجی تم کو مرے سر کی قسم
اس طرف کو بھول کیونکر آئے صاحب کیا ہے آج
ہر چمن میں چاک دامانی پہ میری کر نظر
خاک سے نکلا گریباں چاک کر لالا ہے آج
حُسن کی گرمی سے آہو نے نکالی ہے زباں،
کب فریبِ چشم یہ سرمہ کا دنبالہ ہے آج
داغِ دل روشن ہے سینے میں نکل مت آہِ سرد
سے چراغانِ دوالی سے دیا بالا ہے آج
اتنی بے ادبی لکھی بعد از فنا قسمت میں تھی
ساتھ جو میرے جنازے کے تو اب چلتا ہے آج
طفلِ دل سودے پہ کاکل کے نہ جا بالا بھی ہے
دام کے اندر چھپا کر دام وہ نکلا ہے آج
لکھ بتبدیلِ ردیف و قافیہ مطلع نیا
شعر کا عاصی ترے اس شہر میں چرچا ہے آج

ے چراغ روشن کیا ہے۔

تجھ سے اے رشکِ مسیحا اس کا ہوگا کیا علاج
یہ مریضِ غم وہ ہے کہتے ہیں جس کو لاعلاج

دیکھ لے اس کی طلائی پتی اور بالے[1] کی گونج
گر نہ دیکھی ہوئے ہمدم ماہ کے ہالے کی گونج
شبِ فراقِ مہ جبیں میں ہم نے وہ نالہ کیا
گنبدِ گردوں گیا آواز سے نالے کی گونج
زلف تو اُلجھی ہے پر ڈر ہے نہ مُرکی[1] کی تری
مار بیٹھے نیشِ عقرب جسم میں کالے کی گونج
ہے پکھاوج کا ہر اک پلٹا سریلا گونجتا
تھاپ پر سم کی ہے جب سے آڑے[2] چوتالے کی گونج

کُشتۂ دیدۂ فتّاں کو تو بادام نہ بھیج!
پختۂ مغزانِ جنوں کو ثمرِ خام نہ بھیج

کاٹ کر پر کس لئے توڑی بُتِ بے پیر چونچ
باندھنی تھی طائرِ عنقا کی زیرِ تیر چونچ
چوراچوری لا دیا رانجھا کا پیغامِ وصال
زاغِ ظلمت کی منڈھا سونے سے اب تو ہیر[3] چونچ

---

[1] کان کا زیور
[2] طبلہ کی ایک تال کا نام
[3] ہیر رانجھا کے مشہور پنجابی قصّہ کی طرف اشارہ ہے

آشیاں باندھے نہ کیوں شاخِ محبت پر بلند
ہے بنے کے گھر میں ساری صاحبِ تدبیر چونچ
آج پھر حسنِ بتاں کی گرم بازاری سے ہے
کھولے بیٹھا ہے جو ہر اک مرغِ آتشگیر چونچ
رکھ دیا جیتابیٔ دل نے ہماری نامہ پر
طائرِ سیماب کے گُنکا دہن میں جیسے چونچ
بلبلِ باغِ سخن وہ ہوں، کہ میرے روبرو
بند ہو طوطی کی اے عاصی دمِ تقریر چونچ

ردیف د

شکوۂ جور ہو کس سے لبِ اظہار ہیں بند
موت آجا، کہ ترے بن مرے سب کار ہیں بند
ہو نے کیوں، کس لیئے ہر بات میں سرکار ہیں بند
کہدو ڈر ڈر تو دہن میں دُرِ شہوار ہیں بند
تجھکو گلرُو سے مرے دعوے ہم چشمی تھا
اس لیئے دیدہ ترے نرگسِ بیمار ہیں بند
اُف بھی کر سکتے نہیں اب تو شبِ ہجراں میں
سینہ میں شعلے تہِ آہ شرر بار ہیں بند
طائرِ قبلہ نما وار ہم اسے مرغِ سحر
چھوٹ سکتے نہیں اس دام سے ناچار ہیں بند
میکدے ٹوٹے، کہ پھوٹی کہیں مینائے شراب
اب جو مے پینے سے مینوش و قدح خوار ہیں بند

قطعہ

کون اس پردہ زنگاری میں بیٹھا ہے فلک
اس جگہ جو سبھی عاقل و ہشیار ہیں بند
ماہِ نو عقدۂ پرویں کی گرہ کیا کھولے
ایک ناخن پہ ستارے وہاں دو چار ہیں بند

قطعہ

شب کو مجھ سے وہ لگے کہنے کہ فرمایئے تو
مٹھیوں میں مری کیا ہے جو اے یار ہیں بند
تب کہا میں نے خبر غیب کی اللہ کو ہے
جانے خالی ہیں، کہ اُن میں دُرِ شہوار ہیں بند
کشتۂ زلف کو دے تارِ رگِ جاں قسمت
سانپ کے کاٹتے ہی باندھنے ناچار ہیں بند
شعر میں عاصیؔ اسوا کے مزا ہے صاحب
فکر باریک ہے اور معنی دشوار ہیں بند

جب سے فرقت میں تری دیدۂ خونبار ہیں بند
تب سے نادیدۂ دیدار ہوں سب کار ہیں بند
خم گیسو میں کہاں لختِ دلِ زار ہیں بند
پارۂ لعل بہر مُوئے شبِ تار ہیں بند
کیا کہوں کس سے کہوں ہائے کدھر سے جھانکوں
خانۂ یار کے سب روزنِ دیوار ہیں بند
گھر میں صیاد جفا پیشہ کے مرغانِ چمن
بسمل زار ہیں دو چار تو دو چار ہیں بند
غور سے دیکھا تو اس ہستیٔ موہوم کے بیچ

دامِ اُلفت میں سبھی غافل و ہشیار ہیں بند
گرم بازاری یوسف ہے زلیخا پہ کھُلی
کشورِ حُسن کے جو کوچۂ و بازار ہیں بند
غور سے دیکھو تو اس جبا ۂ فیروزی میں
کیا مٹکے مسلمہ ستارے کے طرحدار ہیں بند
بندہ پرور صفتِ بند ہیں ہے بند زباں
بخط تارِ شعاعی وہ طِلا کار ہیں بند
آفریں کہتے ہیں سب اہلِ سخن عاصی کو
دُرجِ معنی ہیں سب اسکے دُر اشعار ہیں بند

ہم جو آنے سے ترے کوچے میں اے یار ہیں بند
نہیں معلوم کہ کیا باندھتے اغیار ہیں بند
ہے جو شیریں تیرا آبِ دمِ خنجرِ قاتل،
ہوتے میرے لب زخمِ دلِ افگار ہیں بند
سدِّرہ آنسوؤں کے ہو مری مژگاں کیونکر
باندھ سکتے نہیں دریا کا خس و خار ہیں بند
دل میں کیا ان کے گرہ ہے کہ جو کھُلتے کھُلتے
مجھ سے ہو جاتے وہ اکثر دمِ گفتار ہیں بند
ٹکٹکی رہتی ہے تا صبح ستاروں کی تگی،
ہوتے کب ہجر کی شب دیدۂ بیدار ہیں بند
جھانکتے ہیں اُسے ہم روزنِ دل سے اپنے
نہیں پروا ہمیں گر رخنۂ دیوار ہیں بند

لہ مانند

بات کرنے کا نہیں منہ جو ہمارے آگے
رکھتے ننہ غنچۂ گل باغ میں ناچار ہیں بند
تابِ رُخ سے جو ترے برق سی جاتی ہے چمک
آنکھیں ہو جائیں سبھوں کی وہیں ناچار ہیں بند
اسکو کیا لکھتے ہو عاصی نہیں کھلتا مضموں
روز کاغذ کے سیہ ہوتے جو دو چار ہیں بند

چڑھے جو بام پہ تم کر گیا کنارا چاند
اب آؤ جانے دو تم جیتے اور ہارا چاند
لگایا اس بنے نشانہ جو چاند ماری میں
تو بولے چرخ پہ تارے کہ لو وہ مارا چاند
ہٹوا ہے سینہ و دل چاک چاک دل سے ترے
کتاں کو کرتا ہے جس طرح پارہ پارہ چاند
غرورِ حسن نہ ہو کیونکر سادہ رویوں کو
کہ جن کے آگے فلک پر ہے اک چکارا[۱] چاند

یوں ہجومِ مژہ ہے چشمِ دلارام کے گرد
جس طرح حلقۂ مستاں ہو کہیں جام کے گرد
دوستو ہوتے ہو کیوں اس بُتِ خودکام کے گرد
وہ بھٹکنے کا نہیں عاصیٔ بدنام کے گرد

---

[۱] ہرن کا بچہ

مخمس

بر غزل شاہ نصیر اُستاد عاصی

صبر کہتا تھا یہ ہو کر ترے بدنام کے گرد
دیکھ کافر نہ پھٹکنا کبھی اسلام کے گرد
بیٹھنا ہے جو تجھے گوشۂ آرام کے گرد
دلِ بیتاب نہ جا زلفِ سیہ فام کے گرد
کام کیا طائرِ سیماب کا ہے دام کے گرد

بل بے او گردشِ سوزِ غمِ ہجرانِ جنوں،
نالۂ دل یہ کہے ہے بزبانِ محزوں،
آرزوئے جگرِ تفتہ جو کہیئے تو کہوں،
یہ تمنا ہے کہ جوں صورتِ جوّالہ پھروں،
شمع رُو اِس دلِ بیتاب کو میں تھام کے گرد

کیوں یہ شہدِ ذقن پائے مگس کو چھیڑا،
خالِ رُخ کہتا ہے حسن بڑا نہیں ہے میرا،
حسن نے کیا خطِ گلگوں سے ہے عارض پھیرا،
لشکرِ مور[1] نے ہے تنگ[2] شکر کو گھیرا،
خط نہیں ہے یہ لبِ شوخِ گل اندام کے گرد

میں نے طوفان کہا تھا تجھے جب سیلِ سرشک
اس جگہ کون تھا، کیا وقت تھا، کب سیلِ سرشک
آنکھیں دکھلانے کا ہے تجھ بھی سبب سیلِ سرشک
تجھ سے یہ چشم نہ تھی مجھکو کہ اب سیلِ سرشک
شکلِ گرداب ہو اس عاشقِ ناکام کے گرد

---

[1] چیونٹی [2] تھیلی یا برتن

اُس نے انگشت رکھی ابروئے خمدار پہ جب
عین خوبی سے نمایاں ہوئی طائے مطلب
تب یہ اخوندجی کہنے لگے ازراہِ ادب
مبنی و زلف وہ تیری ہیں، کہ طفلِ مکتب
دیکھ کر رکھتے ہیں انگلی الف و لام کے گرد

تو سنِ وہم نہ پہنچے، نہ خیالِ مردم
دیکھے نہ دیدۂ مہ جس کو نہ چشمِ انجم
رشتۂ تارِ نگہ پھر مجھے کیا پائے تم
میں ہوں اس طرح سراغِ کمرِ یار میں گم
کہ پھٹکتا نہیں عنقا بھی مِرے نام کے گرد

حالِ دل کس سے کہیں کوئی نہیں ہے غمخوار
بس تو ہم جی ہی چکے ہوتے خفا ہیں سرکار
ہم سے پردہ رہے، اور آنکھ لڑائیں اغیار
ہیں مری خانہ خرابی کے یہ پیدا آثار
تو نے کھینچی ہے جو دیوار در و بام کے گرد

کب پسینے کے ہیں قطرات جبیں پر تیرے،
گرمئ حسن نزاکت نے ہیں یہ گل کترے،
دن کو دکھلاتی فلک پر ہے یہ فرقت تارے
تیرے ابرو کے نہیں پاس عرق کے قطرے
یہ پڑی اوس ہے شاخِ گلِ بادام کے گرد

جب سے عاصی کو ہوا عشقِ صنم دامنگیر
تب سے رہنے لگا یہ دل متعلق بہ صفیر

۱؎ حرف ط

اُس پری وش سے کریں وصل کی کیونکر تدبیر
ایک پل گردشِ چشم آہ مجھے اس کی نفیر
جانے دیتی ہی نہیں گوشۂ آرام کے گرد

ردیف ر

تمہارا عاشق جو کھینچے نالہ فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
تو ہو قیامت پھر ایک برپا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
کوئی بھی ثانی نہ تیرا نکلا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
تو ایک دلبر ہے ماہ سیما فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
پری کے ہوش اُڑ گئے سراسر نہ آئی خجلت سے ہبر کے آگے
جو ماہ پارہ کو ہیرے دیکھا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
جو دل کے اُس آفتاب رُو سے مدام جامِ شراب پیوے
وہ نیک طالع ہے اے احبا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
تو آکے اے شوخ ماہ پیکر کبھی جو کوٹھے پہ جلوہ گر ہو
عجب ہے پھر ایک ہو تماشا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
ذرا بھی آنکھیں اُٹھا کے یارب جو سوئے شمس و قمر نہ دیکھیں
گئے ہیں خوباں وہ تو نے پیدا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر
اگرچہ مشہور قیس و فرہاد بس جہاں میں ہیں ایک عاصی
ہُوا نہ دیوانہ کوئی مجھ سا فلک کے نیچے زمیں کے اوپر

لے جا تو دل کو زلفِ گرہ گیر کھینچ کر

وحشی کے باندھ پاؤں میں زنجیر کھینچ کر
اپنے گلے لگا مجھے اک دم تو آن کے
یا ایک گلے پہ چھوڑ دے شمشیر کھینچ کر
کب آئے تھا تو آپ سے دل کی کشش مری
لے آئی تجھکو اے بُت بے پیر کھینچ کر
تسکین کو مرے دلِ حسرت زدہ کی اب
لے آؤ میرے یار کی تصویر کھینچ کر
ہمسائیگاں کے سر پہ قیامت نہ کر بپا
اے دل تو روز نالۂ شبگیر کھینچ کر
کافی ہے اک نگاہ مرے قتل کے لیئے
ابرو کماں لگا نہ مرے تیر کھینچ کر
عاصی نکال آج تو ارمان جی کے اب
مدّت میں لائی یاں تجھے تقدیر کھینچ کر

ترے ہجراں میں جیتے تھے نہیں تھا جی ٹھکانے پر
کہ آرامِ دل و جاں منحصر تھا تیرے آنے پر
اگر درباں لنظر ہووے تیری دو چار آنے پر
تو نے اور دے جگہ مجھکو تک اسکے آستانے پر
تمہارے کسمسانے سے عیاں معلوم ہوتا ہے
کہ باندھی ہے کمر تو نے ابھی سے ہائے جانے پر
عجب عالم ہے اس غنچہ دہن کے مسکرانے کا
کروں کس رنگ جی قرباں نہ اس کے مسکرانے پر
لب ساغر سے لب کرتا ہے وہ غنچہ دہن باہم

نہیں دیتا ہے مجھ کو منہ سے منہ اپنا لگانے پر
ہو اے شمع رُو گرمِ محبت ساتھ غیروں کے
کمر بہرِ خدا مت باندھ عاصی کے جلانے پر

شعلہ رُو غیر کو لے جائے جو گھر کے اندر
کیوں نہ پھر آگ لگے میرے جگر کے اندر
ساتھ رُخ کے ترے کس رُو سے اُسے دوں نسبت
کہ سیاہی سی نمایاں ہے قمر کے اندر
اس کے غرفہ کے نہ کیوں سامنے بیٹھوں مردم
لے گیا آنکھ لڑا دل کو جو در کے اندر
بحر میں حسن کے جوں کان کے موتی تیرے
اشک یُوں چمکے ہیں اِس دیدۂ تر کے اندر
اے دل آرام مرے دل کو ہو کیونکر آرام
لاؤں جب تک نہ تجھے اپنی میں بر کے اندر
کیا کریں ہم کہ ہمیں عشقِ بُتِ خانہ خراب
ناصحو بیٹھنے دیتا نہیں گھر کے اندر
اس سے منظور جو ملنا ہے تجھے اے عاصی!
بیٹھ اب چل کے کہیں راہگذر کے اندر

لا دے جو بلا مہرِ پُر انوار کے سر پر
سو طرّۂ زرتار ہے دلدار کے سر پر
سونے کا یہ جھومر نہیں دلدار کے سر پر
ہے سایہ فگن پنجۂ خور یار کے سر پر

رکھتا ہے وہ جب ہاتھ کو تلوار کے سر پر
ہے جی میں ترے ٹکڑے کرے مار کے سر پر
نوکِ مژہ پر میری ذرا اشک کو دیکھو
دیکھی نہ ہو شبنم کبھی گر خار کے سر پر
شیریں کو ذرا بھی نہیں پروا تری فرہاد
بیٹھا ہے عبث تیشہ تو اک مار کے سر پر
صیّاد اسیر آج ہوئے صید ہزاروں
بھاری ہے قفس رکھ اسے بیگار[1] کے سر پر
برقع کو اٹھا دو رُخِ تاباں سے ذرا تم
احساں کرو اس طالب دیدار کے سر پر
صیّاد نے اُس مرغِ گلستاں کو نہ چھوڑا
بیٹھے تھا سدا جو گلِ گلزار کے سر پر
دن کاٹا تھا رو رو کے کرے خیر الٰہی!
اب رات پھر آئی ترے بیمار کے سر پر
سنتے ہیں کہ وہ مہر لقا نکلے گا عاصی
کر آج نشست اپنی تو بازار کے سر پر

اُبھری ہوئی وہ دیکھ کے مچھلی کو[2] ڈنڈ پر
یارب ہے کس قدر بُت کافر گھمنڈ پر
تعویذ لعل دیکھ لے جب اُسکے ڈنڈ پر
چیکے نہ مہر کیوں نہ ہو پھر وہ گھمنڈ پر

---

[1] بیگاری [2] بازو

ہووے ہلال شوق سے تب ہمرکاب۔ جب
ہو ماہرو سوار، چھیرے اکھنڈ پر
کافی ہے میرے قتل کو تیغ نگہ تیری،
منت کر و گڑ سے کے صاف سروہی کھرنڈ[1] پر
مجھ پر خدا کے واسطے فصّاد رحم کر
نشتر لگا نہ زخمِ جگر کے کھرنڈ پر
آباد خاک ملک ہو جو حکمراں نے آہ!
باندھی ہو جزیہ پر کمر اور اس کے ڈنڈ[2] پر
گھی اور گوشت زور کو عاصی کریں فزوں
پر منحصر بدن کا سنورنا ہے ڈنڈ[3] پر

لے گئے نیچے دل کو یوں اشک اس ذقن پر کھینچ کر
جیسے سوئے چاہ یوسف کو برادر کھینچ کر
لایا دل سے غرّۂ جوہر کو باہر کھینچ کر
توڑا آئینہ خیالات مکدّر کھینچ کر
ڈر گئے ہم تو تیری بدھی کو دلبر کھینچ کر
تو ہُوا اُلٹا گلے کا ہار خنجر کھینچ کر
نقشۂ خال و ذقن مانی ہوشُشدر کھینچ کر
زاغِ ظلمت کو نکالوں چاہ سے پر کھینچ کر
بل بے جذبۂ خواہشِ وصلِ زلیخائے خرد
چاہِ زنداں سے کیا یوسف کو باہر کھینچ کر

---

[1] ریت جس سے تلوار تیز کی جائے۔ [2] سزا [3] ورزش۔ ڈنڈ پیلنا

شور اس گل تک نہ تا پہنچائیں مرغانِ قفس
اُن کو دانہ دیتا صیّاد ستمگر کھینچ کر
ناتوانی کے ہیں صدقے، کوئے جاناں کی طرف
لے چلی چیونٹی ہمارا جسم لاغر کھینچ کر
یار و احساں ناخدا کا سر پہ لے میری بلا
چھوڑ دوں کشتی خدا پر کیوں نہ لنگر کھینچ کر
حضرت عیسیٰ مریض عشق کی حالت کو دیکھ،
رہ گئے سینہ میں دم اندر کا اندر کھینچ کر
خوش ہُوا دہقاں کہ لوٹی خاک پر کنجشک[1] دل
ابرِ تر جاتا برسنے میں ہے اکثر کھینچ کر
ہو خمِ ابرو نہ سیدھا سو لکھے بہزادِ حسن
صورتِ نقشِ ہلالِ عید مسطر کھینچ کر
اب بدل کر قافیہ عاصی تو وہ مطلع سُنا
عرصۂ مضموں میں اک سدِّ سکندر کھینچ کر

لے آؤ میرے یار کی تصویر کھینچ کر
یا اک گلے پہ چھوڑ دو شمشیر کھینچ کر

شاہیں ہوں اپنے راغ سے دور اور شکستہ پر
قمری ہوں سرو باغ سے دُور اور شکستہ پر
ویرانۂ وجود میں ہُوں نقشِ کالعدم
عنقا صفت سراغ سے دُور اور شکستہ پر

---

[1] شگون ہے، کہ چڑیا خاک میں لوٹتی ہے، تو یہ علامت بارش کی ہے۔

بیٹھا نہ آکے شاخِ نشیمن پہ مرغِ دل
بھٹکا کیا دماغ سے دُور اور شکستہ پر
ٹوٹا پڑا ہے دل چو بطِ مے چمن میں ہائے
ساقی لبِ ایاغ سے دور اور شکستہ پر
قوسِ فلک سے حضرتِ آدم کا بھی خدنگ
بیٹھا تو جسم زاغ سے دُور اور شکستہ پر

یوں ہے اپنی خاک بستر زیرِ پا بالائے سر
جوں شہوں کے تاج و افسر زیرِ پا بالائے سر
کشتۂ ابرو ہوں دے کر غسل آبِ تیغ سے،
ڈالنا شبنم کی چادر زیرِ پا بالائے سر
بحرِ ہستی میں تنگ ظرفی سے مت اُبھرے حباب
تجھکو رکھتا ہے سمندر زیرِ پا بالائے سر
پینگ جھولے کی چڑھا اس شوخ نے دکھلا دیا
عاشقوں کو چرخِ اخضر زیرِ پا بالائے سر
بیٹھا جب پائے حنائی دھوتے دریا پردہ گلُ
کھا گیا گرداں بھی چکر زیرِ پا بالائے سر
کیا طنابِ عشق پر نٹ کی طرح پھرتا ہے دل
باندھ کر شمشیر و خنجر زیرِ پا بالائے سر
شاخِ آہو مت سمجھ ان کو کہ یہ نکلے ہیں قیس
خارِ دشتِ یاس چبھ کر زیرِ پا بالائے سر
شب جو تلووں سے ملے جھومر گئے گوہر توڑ کر
بن گئے گوہر سے اختر زیرِ پا بالائے سر

پاؤں میں مہندی ہے سر پر سُرخ چادر ہے بہم
ہے نمایاں عکسِ مجمر زیر پا بالائے سر
آئینہ کو ٹھوکروں میں ڈال اس نے یوں کہا
دیکھ لو چرخِ مکدّر زیر پا بالائے سر
پھرتے پھرتے مر گیا سر پھوڑ کر وہ کوہکن
اس کے تھا شیریں سنیچر زیر پا بالائے سر
کہکشاں جس وقت نکلی اس نے مجھکو قتل کر
دیکھ لیا لوہو کا خنجر زیر پا بالائے سر
مجھ غریقِ حسن پر یوں آ کے پانی پھر گیا
جس طرح موجِ سمندر زیر پا بالائے سر
روشنی دکھلائے ہے مرقد پہ آہِ آتشیں
شعلۂ جوّالہ بن کر زیر پا بالائے سر
ہر گلِ حسرت ہنسے تھا روئے تھی شمعِ لحد
بعدِ مُردن حالِ دل پر زیر پا بالائے سر

لالہ ہو لال عارضِ احمر کو دیکھکر
عنبر ہو خاک زلفِ معنبر کو دیکھ کر
بن تیرے شب ہُوا خفقاں گھر کو دیکھکر
آنکھوں سے نیند اُڑ گئی بستر کو دیکھ کر
اس طرح میرے دل پہ پڑی ہے نگاہِ یار
بہری گرے ہے جیسے کبوتر کو دیکھ کر

۱؎ دیکھا سنیچر کی پاؤں میں ہونے سے آدمی بہت پھرتا ہے۔ ۲؎ شکاری پرند۔

مدّت میں آج مجھکو میسر ہُوا یہ دن،
پہلو سے میرے غیر کو مت سرکو، دیکھکر
کیونکر نہ روئیں ہم شبِ فرقت میں اے فلک
وہ خال یاد آئے ہے اختر کو دیکھکر
نالے کو میرے سُن کے کیا شور رعد نے
بجلی تڑپ گئی دلِ مضطر کو دیکھکر
بلبل مرے جو گل پہ تو پروانہ شمع پر
قمری نے طوق پہنا صنوبر کو دیکھکر
تھا دل میں یہ کہ ہم بھی بھریں شاعری کا دم
پر ڈر گئے ہم ان کے دو اَچھر[1] کو دیکھکر
عاصی شب اس کے کیا دُرِ دنداں کی یاد میں
آنسو ٹپک پڑے مرے گوہر کو دیکھکر

تیغِ نگہِ قاتلِ خونخوار اُٹھا کر
طوفان دکھاوے سرِ بازار اُٹھا کر
وہ تیرِ نگہ چھوڑے جو اک بار اُٹھا کر
اِک دم میں لُٹا دے صفِ گلزار اُٹھا کر
قاتل نے تب ہاتھ میں ناچار اُٹھا کر
سر تن سے قلم کر دیئے دو چار اُٹھا کر
مر جائیں گے ہم عشق کا آزار اُٹھا کر
کر دیں گے یونہی جان کو فی النار اُٹھا کر

---

[1] ہندی بمعنی حرف

چھڑکے ہے نمک شورِ محبت بہ لبِ زخم
سینہ سے مرے مرہمِ زنگار اُٹھا کر
وہ مہروش آیا جو دمِ صبح چمن میں،
شبنم نے لٹائے دُرِ شہوار اُٹھا کر
اُس رشکِ گلستاں کی جدائی میں مرا ہوں،
لاشہ مرا رکھنا سرِ گلزار اُٹھا کر
پچھتائے ہیں اس شوخ ستمگار کے آگے
نامہ پہ مری مُہر وہ اغیار اُٹھا کر
کرتا ہوں تصدق بہ خمِ ابروئے جاناں
سو قبضۂ شمشیرِ طلا کار اُٹھا کر
مردم کی جگر کاہش مژگاں سے رکھیں گے
چشمِ دلِ پُر آبلہ میں خار اُٹھا کر
سووے پہ مٹا زلف کے ہے طفلِ دل اپنا
اے آہ اسے گود میں چمکار اُٹھا کر

قطعہ

رہ جائے گی یاں دولتِ دارا و سکندر
لے جا ہیں گے ساتھ اپنے نہ زنہار اُٹھا کر
آئے تھے بندھے مٹھی تو جائینگے کھُلے ہاتھ
چھاتی پہ نہ لے جائیں گے دینار اُٹھا کر

قطعہ

قسمت ہوئی جب عشق کی سرکار سے منصب
ہم نالہ و ہم درد، ہم آزار اُٹھا کر
قمری کو ملا طوق تو پروانہ کو جلنا،

غم ہمکو دیا سب میں سے دشوار اُٹھا کر

عاصی نہیں ہل سکتے ہیں ہم بستر غم سے
جب تک نہ بٹھائیں ہمیں دو چار اُٹھا کر

وہ معجزے سے حسن کے اپنے کمال کر
ابرو ہلا کے چاند کے دے دو ہلال کر
لوٹے تھا کل مریض ترا جو بروئے خاک
سنتے ہیں آج یہ، کہ گیا انتقال کر

عاشق زار ہوں مجھ پر ستم ایجاد نہ کر
مری گردن کو تہ خنجر پولاد نہ کر
کون کہتا ہے رقیبوں سے کچھ ارشاد نہ کر
پر مری یاد فراموش کو تو یاد نہ کر
سامنے میرے تو کچھ غیر سے ارشاد نہ کر
یہ ستم تازہ ستم ہے ستم ایجاد نہ کر
نہ لڑا دیدۂ دانستہ کسی غیر سے دیکھ
مردم چشم لڑائی کی تو بنیاد نہ کر
خفتگانِ عدم اک آن میں چونک اُٹھیں گے
قبر پر اُن کی تو دامن کو جھٹک باد نہ کر
بس ہے اک جنبشِ نوکِ مژۂ تر لیلا،
رگ پہ مجنوں کی سر نشتر فصّاد نہ کر
میں نہ کہتا تھا کہ تجھ کو یہ ڈسے گی ناگن،

ناز اس زلف کی تصویر پہ بہزاد نہ کر
بیٹھ کر گوشہ میں ٹک کنجِ قفس ہیں رو لے
مُرغِ دل قیمتِ صیّاد پہ ایراد[1] نہ کر
رنگ[2] بازیٔ چمن گنجفۂ عشق ہیں ہوں
دیکھ شیریں تو یہ سر[3] جانبِ فرہاد نہ کر
ٹیپ[4] لیتے ہی یہ کھل جائے گی بازی ساری
اِک ترخی[5] آلا پہ زنہار تو دل شاد نہ کر
تو ہے دریائے معانی کا شناور عاصی
موجِ طوفانِ طلاطم سے تو فریاد نہ کر

دے جام تو ہی ساقیِ سرشار اُٹھا کر
پینے کے نہیں آپ سے میخوار اُٹھا کر
قاتل سے نزاکت کے سبب اُٹھ نہ سکی تیغ
گردن پہ رکھی ہم نے ہی ناچار اُٹھا کر
بلبل تو عبث شور مچاتی ہے، بھلا ہم
لے جائیں گے سر پر کہیں گلزار اُٹھا کر
اِک دم تو ذرا بیٹھنے دے یاں کہ بہت رنج
آئے ہیں تیرے کوچہ میں ہم یار اُٹھا کر

---

[1] اعتراض [2] اصطلاح گنجفہ [3] اصطلاحِ گنجفہ میں دوسرے کو سر دینا یعنی ہاتھ دینا۔ [4] اصطلاح گنجفہ جس میں ایک ہاتھ بنانے کی بجائے دو ہاتھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اگر ٹیپ کٹ جائے۔ تو پھر دوسرا ہاتھ نہیں بنتا۔ اور ایک سر ضایع جاتا ہے۔ [5] اصطلاحِ گنجفہ

جُوں نقشِ قدم بیٹھا ہُوں در پر تیرے دیکھوں
لے جائیں گے کیونکر مجھے اغیار اُٹھا کر
نادم ہُوا تدبیر سے جب اُس کی مسیحا،
لائے تیرے بیمار کو دو چار اُٹھا کر
سو رہیے اب عاصی کہ اُسے خواب میں شاید
لے آئیں یہاں طالع بیدار اُٹھا کر

فرد

رکھ کے خامہ کا تلے کا رد فولاد کے سر
بولے، کر ڈالے قلم یُوں کئی ناشاد کے سر

فرد

طور پر جُوہر کو اُس کے دیکھ لے موسیٰ اگر
ہے یقیں سُوئے تجلّی پھر نہ دیکھے بھر نظر

مژدہ سُنایا پیکِ صبا نے یہ آن کر
گلشن میں ہے عروسِ بہار آج جلوہ گر
ہے چار طرف چہچہہ بلبل طرب رساں
غنچہ گرہ کو کھولے ہے گل پھینکتا ہے زر
لایا ہے اک شگوفہ گلُ تازہ نسترن
شرمندہ جس کو نرگسِ شہلا ہو دیکھ کر
دل نے کہا دہ دیکھتے ہی کیوڑہ کے جھاڑ
اس سرزمیں میں کس کا ہے یہ کشتِ نیشکر

قطعہ

ہر برگِ گلُ پہ دانۂ شبنم کو دیکھ کر

آپس میں مِل کے کہتے تھے یہ صاحبِ نظر
کیا صنع سے یہ صانعِ قدرت نے اپنی آج،
پیدا کئے ہیں کان زمرد سے اب گہر
توجِ نسیمِ صبح سے مہکے ہے موتیا
شبّو سے باغ میں ہوئی خوشبو وہ طرفہ تر
نشو و نمائے سبزہ و سنبل کہاں ہے یاں
اتنی لپٹ رہے ہیں یہ صندل کے جھاڑ پر
مدّت میں جس طرح کوئی ملتا ہے یار سے
یوں بیل عشق پیچہ کی پیچاں تھی بر شجر
دیکھا جو گیندا ہاتھ میں صد برگ ہے لئے
داؤدی بھی کھڑی ہوئی سینہ کو کر سپر
گلہائے عشق دیکھو تو سینے پر اپنے کیا
لالہ زمیں سے نکلا گریبان چاک کر

قطعہ بہاریہ

یہ حکم عام شاہ گلِ اشرفی کا ہے،
جا کر یہ باغباں کو صبا جلد دے خبر
شکھ درشن اب کے سال جو یہاں کوتوال ہے،
کہدے کہ کرنا[1] تو ذرا پھونکے آن کر
سامانِ جنگِ بادِ خزاں ہے وہ اب کے سال
ہے مستعد بجنگ یہاں تک تو ہر شجر
پہنے ہوئے وہ خود ہے سر پر چکوترا
جس کو کسی کا خوف نہیں، نے کسی کا ڈر

---

[1] کرنا = بگل بجانے

لے لے نہ کیونکر سنگترا سنگ ہاتھ میں
خنجر رکھے ہزار جو کیلے کا ہر شجر
دیکھا ترنج کو جو تپنچہ لئے ہوئے،
کمرک نے بھی وہاں رکھی چاروں طرف نظر
پلٹن کو اپنی دیتے قواعد تھے یوں انار
ہشیار رہنا باغ میں بے خوف بے خطر
بہ طرفہ ماجرا ہے کٹھل بھی غلاف ہے،
کھوئے ہے رنگ دیکھنے کے واسطے تبر
پی کر شراب پھرتے ہیں جوں میکدہ میں مست،
یوں جھومتا ہے جوش میں مستی کے ہر شجر
اور موجِ آبِ جُو میں نظر آئے عکسِ سرو
آتی تھی ایک سرو کی پلٹن کھڑی نظر
پاکیزہ نہر آب وہ تھی اس چمن کے بیچ،
ہو آبِ آئینہ جسے حیران دیکھ کر
تھے یہ مجھے خوش آتے صدا باغباں نے کی
گجرے سے چنبیلی موتیا رکھے ہیں گوندھ کر
کہدے یہ کوئی بادِ خزاں سے کہ اب کے سال
آنے کا قصد باغ میں تو نے کیا اگر
لگوائے گی چھپیٹرے تیرے پھر وہ عندلیب
لالہ ہزار آ بیگ کی گارد میں سونپ کر
مطلع سنا کے مدح میں گلشن کی ایک اور
آگے تو وصف خواب کا عاصی بیان کر

پھلتا ہی پھولتا رہے یارب صدا یہ باغ
جس کی ہوا ہے سیر سے دل اپنا تازہ تر
کروٹ جو میں نے بدلی دم صبح خواب سے
دیکھوں ہوں کیا، کہ ایک تماشا ہے طرفہ تر
آکر میرے سرہانے کھڑی اِک پری ہوئی،
کھولی جو میں نے آنکھ، مجھ کو پڑا نظر
مکھڑا وہ قہر، قد وہ قیامت، غزالِ چشم،
حیراں ہو جس کو جادوئے بنگالہ دیکھکر
ہو جائے میلا چھوتے ہی وہ آب و تابِ حسن،
بادِ نسیم پاس سے جائے نکل اگر
اللہ رے حسن، بل بے نزاکت، کہ ہاتھ اُٹھا
مانگے ہیں جس سے نور شب و روز ماہ و خور
دل مانگ ہی لے زلف کے سربستہ کوچہ میں
بھولا پھرے ہے جس میں پڑا اب تلک خضر
جھومر کو اسکے دیکھ کے رہتا ہے یہ خیال
سر پر ہے اس کے سایہ فگن پنجۂ قمر
لکھا ہے خطِ نسخ میں اَللّٰہُ اکبر آج
صانع نے اس کی چینِ جبیں ہی کو دیکھکر
پاں خوردہ لب پہ یا ہے مِسی کی جمی دھڑی
شبخوں پہ عاشقوں کے یہ باندھی ہے یا کمر
کب میل[1] سرمہ آنکھوں میں پھیرے ہے وہ پری
بلّی لگی ہے کشتیٔ دریائے حسن پر۔

---

[1] سلائی

ابرو ہیں یا کہ متصل چشمۂ خضر
خیمہ کھڑا ہے چشمۂ آبِ حیات پر
آنکھیں امی ہلاہلِ جادو سے کم نہیں
دکھلائے عاشقوں کو گہے شام گہ سحر
دل میں اگر خیال تبسم کا اس کا آئے
دیوانہ قہقہہ وہ بنا جائے جان پر
جوں غنچۂ کنول ہیں وہ اُبھری ہوئی کچیں
گرداب ناف ایسا کہ دریا میں ہو بھنور
اے دل نہ رہ خیال کمر میں تو اُسکے غرق
عنقا کی طرح ورنہ تو بھولا پھرے گا گھر
لکھنی ہے مدح تجھکو مہاراجا جی کی آج
طبع رسا کا تجھ کو دکھانا ہے کچھ اثر
مطلع وہ لکھ کہ مطلع خورشید کی طرح
روشن ہو جس کی تاب سے ہر ایک کی نظر

مسند پہ جب تو وقتِ سخاوت ہو جلوہ گر
راجہ کرن کھڑا ہو خواصی میں لے چنور
کانپیں ہیں خوفِ عدل سے تیرے وہ رُوسیاہ
لے جائیں تھے جو آنکھ[1] سے انجن نکال کر
سنتے تھے جو کبھی، سو ترے دیکھا عدل میں
شیر اور بکری پیتے ہیں آب ایک گھاٹ پر

---

[1] آنکھ سے کاجل نکالنا - بہت چالاکی کرنا

توسن کے نعل کا ہے تیرے عکس اے شہا
یہ ماہ نو کہاں ہے نمودار چرخ پر
بل بے سبک روی تیرے توسن کی چوں حباب
سُم ڈوبتا نہیں ہے چلے جس دم آب پر
اور تیز گامی اس کی بیاں کس سے ہو سکے
صرصر بھی ہمرکابی سے کرتی ہے الحذر
ہاتھی بھی تیرا کوہِ زمرّد سے کم نہیں،
خرطوم خوشنما ہے کہ جوں آسوۂ خضر
بندوق کے نشانہ کی تیرے وہ دھاک ہے
کانپیں ہیں خوف جان سے ہر طائر و بشر
ناوک سے تیری سہمیں نہ کیوں عرش آشیاں
نکلا کماں سے اور گیا افلاک سے گذر
سرسبز ہونا جن کا کہ امر محال تھا
اُن سب کے نخل یاس کو تو نے دیا ثمر
عاصی کی یہ دُعا ہے کہ باغ جہان میں
نخلِ اُمید تیرا ہمیشہ ہو بارور

ردیف ز

قصیدہ در مدح شاہ اکبر ثانی بر موقعہ جشن نوروز

نوروز کا جو رنگ ہوا اب کے سال سبز
ہو مزرعۂ زمانہ یقیں ہے کمال سبز

لہ چال چلن - روش

روئیدگی کا جوش یہاں تک ہو خاک ہے
ہو گُل زمین جس میں یہ ہے تخمِ خال سبز
ہے آرزوئے سبزہ شدن خاک کاسہ تک
کرتا ہے ظرف روغنی اکثر کلال سبز
شاخِ کمانِ ابرو پہ وسمہ لگاتے ہیں
فیض ہوا سے آج بُتِ مہ جمال سبز
ہوگا نہ کوئی خشک ہرے زخم کے سوا
چوگاں سے تیسرہ لائے گا پتّی نکال سبز
پیکان کو بھی چاہیے ہو جائے ایک دم
برگِ حنائی مرح تمام و کمال سبز
تاثیر سبز بختی مستوں سے ہو گئے،
مینا کی طرح سبزہ میں چھپ کر جیال سبز
ہو جوشِ لالہ ہیں گل داغِ پلنگ سُرخ
ہو جوشِ سبزہ میں سرِ شاخِ غزال سبز
رنگِ بہار بھی کسی آب دہن سے ہے،
مسواک سے ہو لے کے غرض تا خلال سبز
سرسبز ہو کے سرو سے کر جائے ہمسری
دے شمع ساز کوئی اگر شمع ڈھال سبز
ہر برگ و بیل و شاخ ہو گر حرفِ نامِ یار
دے گودے[1] ہاتھ پر کوئی آشفتہ حال سبز
دکھلاتا سبز باغ ہے مستوں کو یہ نشہ
خضرِ رہِ نشاط ہی ہے جو نہال سبز

---

[1] گودنا۔ سوئی سے ہاتھ یا کلائی وغیرہ پر نام لکھنا

ہے جامِ داغ میں پرِ طاؤس کے وہ رنگ
مینا کرے جو ایسا کوئی کیا مجال سبز
پان اور مسی سے ہیں لبِ ساقی سیاہ و سُرخ
اِس خط سے مغبچوں کے ہوے سُرخ گال سبز
لبریز اُدھر ہے ساغرِ نیلم میں سُرخ مے
دی جامِ لعل میں ہے اِدھر بھنگ ڈال سبز
سنبل تو کیا، کہ سنبلہ چرخ کا بھی رنگ
بتلاتے ہیں منجم فرخندہ سال سبز
نشو و نما سے دانہ نمط نقطہ ہائے رمل
حیرت نہیں، کہ دیکھے اگر دانیال سبز
کرتی عطائے خلعتِ فیروزئی بہار
پیرِ فلک کے سر پہ ہے یہ کہنہ سال سبز
کہتی ہے عکسِ سبزہ سے یوں موج آبِ جو
ہر بیضۂ حباب کو تو رنگ ڈال سبز
یہ فیض اس کے ابرِ کرم کا ہے، ورنہ تھا
نخلِ مرادِ خلق کا ہونا محال سبز
وہ کون شاہِ اکبرِ ثانی جہاں پناہ
باغِ جہاں ہے جس کے یہ ابرِ نوال سبز
ہو جائے اس کے گلشنِ مدحت میں یک قلم
نرگس کی شاخ اور یہ کلکِ خیال سبز
مطلع وہ تہنیت میں پڑھوں اسکی میں، کہ ہو
آگے مرے نہ طوطیٔ شکر مقال سبز

پوشاک تیری وہ ہے بشۂ خوشخصال سبز
طوبیٰ ہو جس کے سایہ سے ہو کر نہال سبز
ابرِ کرم سے ہوں تیرے یکسر خطوطِ مہر
گشتِ فلک میں جیسے کہ گیہوں کے بال سبز
ہے برگِ پان رخصتِ جانِ حریف کو
زہر آب سے جو تیرا کٹار ایک ڈھال سبز
کیا سرخرو ہو بارگی میں تجھ سے مدعی
ہو جائے اس کا رنگ بوقتِ جدال سبز
دیکھے جو تیرے سپرۂ شمشیر کو کوئی،
حیران ہو کہ نکلا کہاں سے ہلال سبز
گلگوں کا حاشیہ ہے تیری سبزہ، یا کہ آج
آتا نظر ہے دامنِ بادِ شمال سبز
گلگوں نہیں فلک ہے، کہ جس کے گلے میں ہے
ہیکل کا ڈورہ قوسِ قزح دار لال سبز
طرزِ خرام اس نے وہ پائی ہے، کہ جس کو دیکھ
گردوں بھی زہر کھائے برشک و ملال سبز
تاثیرِ عدل سے تیرے شعلہ عجب نہیں
پوشاک بدلے جب کوئی رفعِ جلال سبز
گر اپنے زیرِ سایہ تیرا آفتاب حکم
چاہے ریاضِ دہر کو ہے برشگال سبز
مژگانِ قیس ناقۂ لیلا کے واسطے
ہوں دھوپ ہی میں خارِ بیاباں مثال سبز
ہر سبز سرخرو ہے تیرے فیضِ مدح سے

منقارِ طوطیوں کی جو ہے سرخ بال سبز
عاصی یہی دعائے سحر ہے، کہ جب تلک
ہوں ابرِ نو بہار سے دشت و جبال سبز
نوروز ہو وے تجھکو مبارک سدا شہا
ہو نخلِ عیش تیرا علی الاتصال سبز
حاسد کو تیرے سایہ میں دم لینے کے لئے
پائے نہ اک شجر سرِ دشتِ خیال سبز

ردیف س

قصیدہ در مدح مسٹر بارنس صاحب

بحرِ امواجِ کرم صاحب بہادر بآرنس،
فی الحقیقت صورتِ انساں میں ہیں عیسیٰ نفس
نیرِ اقبال جس کا خیمۂ گردوں پہ روز،
ہر سحر دیتا چڑھا ہے ایک سونے کا کلس
اور باغِ دہر میں دیکھا تو اسکے خلق سے،
قند بنجاتا ہے بہرِ طائرِ مور و مگس
یہ ہوا جس روز سے اِس شہر میں جلوہ فروز،
تختۂ گلزار یکسر بن گیا دشتِ عبس
معدلت سے اس کی پیتے آب ہیں سب ایک جا
جو کہ ضد رکھتے ہیں باہم جا نور آپس میں لبس
جان کر اس کو فقط سرچشمۂ آبِ حیات
آب دیتے ہیں بگشتِ گندم و خال و عدس

اُس کے خوفِ عدل سے دیکھا تو کوہ و دشت میں
شیر کو بکری پکڑتے ہیں نہیں ہے دسترس
اتفاقاً خوبیٔ قسمت سے اب حاصل ہوئی
تھی قدمبوسی کی مدت سے جو عاصیؔ کو ہوس

ردیف ک

لگاتے ہم تو شب در پر ترے دلدار گردن تک
کریں کیا پر ترے گھر کی نہ تھی دیوار گردن تک
مریضِ غم کی تیرے اب یہ حالت ہے کہ بستر سے
اُٹھا کر ہاتھ لا سکتا نہیں اِک بار گردن تک
دکھا تجھ بن مجھے جامِ مئے گلنار گردن تک
بٹھا دیتی ہیں خوں میں دیدۂ خونبار گردن تک
یہ دیکھو خوبیٔ قسمت کہ پھر سینہ پہ آ بیٹھا
وہ لے نکلا کماں سے تھا خدنگِ یار گردن تک
چمن میں خوشنما کیونکر نہ ہوں طاؤس اور قمری
قبائے مخملی گلدار ہے اور ہار گردن تک
لگا چھاتی سے رکھتا جوں بطِ مے سیلِ اُلفت کو
پھروں اس وار سے اس پار سو سو بار گردن تک
دلِ گم گشتہ کیا عزمِ سفر سے میرا باز آئے
پھرے کب بلبلِ تصویر کی منقار گردن تک
بھری ہے سبز شیشہ میں مئے گلرنگ یہ کس نے
جو ساقی طوطیوں کی سرخ ہے منقار گردن تک

بسانِ ساغرِ گنجشک ہوں پُر از تہی مغزی
کہ تا آنے نہ پائے موج سیل انگار گردن تک

دمِ قتل ہاتھ کانپے تھا وفورِ سخت جانی سے
جو لاکر رہ گیا قاتل مرے تلوار گردن تک

کیا ہے قاتلوں نے جسم عاصی اس قدر گھایل
کہ لگتا ہے دو وقتہ مرہم زنگار گردن تک

فرد

آیا پیام وصل نہ اس بے قرار تک
آخر یہ جاں نکل ہی چلی انتظار تک
مرتے ہی زلزلے یہ لگے آنے دیکھئے
پہنچیگا لاشہ کس طرح اپنا مزار تک

ردیف گ

لگا وہ نشترِ تیر اس میں چھوڑ سنگ کی رگ
کہ ہے یہ کاہکشاں چرخ سبزہ رنگ کی رگ

کٹے چمن میں رگ گل کبھی جو دکھلا دوں،
کھلا کے پان گلوئے بُتِ فرنگ کی رگ

ہو فصد لیلیٰ کی اور خون دے رگِ مجنوں
کہیں بھی دیکھی ہے فصاد ایسے ڈھنگ کی رگ

نشہ جمائیں گے ہم عشق سبزہ رنگوں میں

پئیں گے گھونٹ کے باریک بیز بھنگ کی رگ
یہ سچ مثل ہے، کہ بولے ہے ڈوم کی ہڈی
رہے ہے راگ میں ڈوبی میاں امنگ کی رگ
بجیں ہیں کاسۂ چینی بلے ستار کے ساتھ
جو موج آب سے پیدا ہو جل ترنگ کی رگ
کریں ہیں نیش زنی خار ماہیٔ دریا،
گلو میں ان کی اٹکتی ہے جب نہنگ کی رگ
ہزار کھائے وہ چکر پہ کھینچ لائے ہے گھر
اُترتی ڈور ہی سے ہے چڑھی پتنگ کی رگ
لبانِ رشتۂ سوزن غضب نکالی ہیں،
نہار وے نے کئی ایک بُتِ دبنگ کی رگ
بغور دیکھ تو عاصی یہ بیل کا ہے اُبھار
کہ پھول آئی ہے یادی سے پائے چنگ کی رگ

بسترِ گلُ پر لیٹی ہے کروٹ دیکھو کیسا اک شوخ و شنگ
بل بے تیرا انداز کرشمہ، بلہ رے تیرے ناز کے ڈھنگ
قہر، چھلاوا، چنچل بل آفت، حُسن بھبھوکا سحر نگاہ
چاند سا مکھڑا بوٹا سا قد، اُٹھتا جوبن سبزہ رنگ
جس کے سراپا میں سرتاپا، پہنچے نہ وہم خرد ہیہات
اسکو کرے انگشت نما کیسا، مانی بر صفحۂ اورنگ
جوڑے کا ہنر پر حرف گماں ہے، لیکن بہرِ تجلیٔ نور
طور پہ لٹو ہو بیٹھے ہیں حضرت موسیٰ چھوڑ کے ننگ
عمرِ ابد گر خضر تو چاہے کوچۂ زلف کی راہ نہ چل

مار سفید وہ مانگ بلا ہے گھیرے ہوئے رہ ظلمت و زنگ[1]
خال میان ابروئے جاناں مصحف رُو پر کیب ہے کھلا
شاہیں گندے تول گرا ہے چرخ سے بہر شکار کلنگ
گردشِ چشم مست سے مژگاں پر دلِ عاشق زار تھے یوں
ناوک سے جوں تیر نکل کر آئے بسانِ جستِ پلنگ
چھوڑ کے فکر سراپا دل سے گلشن مدح میں شعر وہ لکھ
سُن[2] ہو پری جوش کے مضامیں حور بہشتی دیکھ کے دنگ
مطلع وہ نو طرز مرصع پڑھ کے سُنا دے اسے عاصی
جس سے ہو ظاہر مدح حافظ عرفی و خاقانی ہوں ڈھنگ

قصیدہ در مدح شہ اکبر

حضرت جہاں پناہ سلامت کیوں نہ لکھیں پرنس کنگ
سر بسجود ہیں در پر تیرے، آن کے سب دانائے فرنگ
شان میں تیری کلک مقدر روز ازل سے لکھتے ہیں
بزم کو جم ہے رزم کو رستم داد کو کسریٰ جود کو گنگ
غلغلۂ جاں بخش کو سن کر پیر و جواں نے شادی کی
باغ جہاں میں سارے شگفتہ غنچۂ و گل ہیں رنگ برنگ
جوشش ہجوم خلق تھا اتنا خلق سے تیرے در پہ شہا
وحدت نور الٰہی نظر میں کثرت علم ہو جس میں دنگ
پھولا سماتا نہیں بر میں ہر ایک دلبر ناز کے ساتھ
حلم سے کرتا کلام و سخن تھا گردن خم ہو شوخ و دبنگ

---

[1] زنگبار۔
[2] سن ہونا، سکتہ کی حالت میں ہونا۔

شلکِ توپ صدائے نوبت عرش تلک جب جا پہنچی
شوقِ دید سے دیکھنے آئے، حور و غلمان بن کے ملنگ

ایسا جہاں میں کوئی نہ ہوگا، جشن کے دن جو نہ حاضر ہوگا
نوعِ بشر تک سب آئے تجھے طے کر کے سو سو فرسنگ

ملک میں کوئی سرکش چھوڑا تیر نے تیرے ترکش کے
مرغِ قبلہ نما تک کانپے لیکہ ز خوفِ سہم خدنگ

شاہنشاہ شاہانِ دوراں مالکِ ملک خدیو جہاں
اللہ اکبر! یہ شیرِ اکبر، جانِ جہان روم و فرنگ

تیرے حضور میں حاضر ہو کر زہرہ مبارکباد میں گائے،
دُہو امشتہ پیر بند اور ترانہ قولِ قلبانا چیتر نگ

ساز بھی سب دمساز نوا ہیں، تان میں زیر و بم کے ساتھ
بین و رباب ستار و کمانچہ قانون اور چنگ و مردنگ

سارے راگ ثنائے شہ میں دیں ہیں دُعائیں آٹھ پہر
بھیروں، میگھ، سری اور دیپک، مال کوس، ہنڈول تلنگ

راگنیاں بھی تیسوں مل کر گاتی ہیں غزل جشن طرب
سوہنی، للت، اساوری، ٹوڈی، مال سری، سوہا، سارنگ

اور جلوس جشن مبارک تختِ شہی پر تب تک ہو
شمس و قمر ہوں چرخ پہ جبتک آب رواں ہو جمنا و گنگ

ردیف ل

رُباعی

جو دانت جوانی میں ہنسا تے کھِل کھِل
وہ اب ہیں بڑھاپے میں رُلاتے ہل ہل
ہے راحت و رنج کا تماشا دُنیا
عاصی سمجھو، کہ کیا ہے دانتا[1] کِل کِل

بلبل سے کہو کھا کے یہ سوگند سرِ گلُ
پھر عین محبّت سے ہے تجھ پر نظرِ گلُ
گر بلبُل شیدا اسے ذرا لُطف سے بولے
تو بادِ صبا کیا ہو بھلا پھر خبرِ گلُ
کیا تاب جو سنبل ہو تیری زلف کی ہمسر
رو کش جو تیرے رُخ سے ہو پھر کیا جگرِ گلُ
کہتی ہے صبا تجھ سے تو گر آئے چمن میں
قربان کروں تجھ پہ وہیں خوانِ زرِ گلُ

قطعہ

اے بادِ صبا جل کے شتابی سے ذرا
بلبُل سے خدا کے لئے کہدے خبرِ گلُ
کرتا ہے سفر یعنی گلُ اے بلبل شیدا
گر تو ہے رفیق اس کی تو ہو ہم سفرِ گل
عاصی نہیں معلوم کہ کیا اسکی خطا ہے
جو بیٹھنے پاتی نہیں بلبل بہ برِ گلُ

---

[1] جھگڑا

ہے وہ رنگیں رُخ تیرا روکش نہیں ہے جس کے پھول
اور نہ تیری چشم کے ہم چشم ہیں نرگس کے پھول
اسکی چشم پر فسوں کو مست کہو نرگس کے پھول
پھول گر کہتے ہو مردم، تو کہو تم بِس[1] کے پھول
گر چمن میں ہو نہ وہ رشکِ چمن تو اے صبا
کس کا پھر سرو لبِ جو، باغ کس کا، کس کے پھول
دیکھ زخم سینہ کی ہے آور ہی اپنے بہار
کیا ہے منہ اے گلبدن جو ہوئے روکش اس کے پھول
مان میری بات تو اے نازنینِ گلبدن
ہاں نہ سونگھا کر تو لیکر ہاتھ سے جس تس[2] کے پھول
یہ شگوفہ ہے نیا گلدستہ کی حاجت نہیں
بن گئے برگِ حنا ہیں ہاتھ میں پس پس کے پھول
چہکنا تھا گلرخوں کا بولتی تھیں بلبلیں،
آئی ہے فصلِ خزاں سارے چمن سے کھسکے[3] پھول
یہ پتہ ہے اس شہیدِ چشم نازِ یار کا
قبر پر اسکی کھلے رہتے ہیں دو نرگس کے پھول
دردِ سر اے یار اسکو عشق کی گرمی سے ہے
سر پہ عاصی کے لگا مچکن[4] کے دو گھس گھس کے پھول

---

[1] زہر
[2] اغیار
[3] چپکے چپکے روانہ ہوئے
[4] گل مچکن سر کے درد کے مفید ہوتا ہے

ردیف میم

ہوگیا بس ہم صفیروں کے جُدا شہپر سے دام
پر رہا لپٹا سدا مرغِ دلِ مضطر سے دام
نقدِ دل ہیں نے دیا اور ساتھ اسکے ڈر سے دام
پر مرے صیاد نے توڑا نہ بال و پر سے دام
گلرُخوں کے دامِ اُلفت کے جو پھندے میں پڑے
قبر پر اس کی نہ کیونکر گُل کی ہو چادر سے دام
دل نہ جوڑا توڑ کر اُس نے نہ اک بوسہ دیا
اور نہ کچھ تاوان ہیں ہاتھ آئے سیمیں بر سے دام
کھولتے پھندا گلو کا پھنس گئی منقار بھی
ہائے اب ٹوٹے گا کیونکر اپنے بال و پر سے دام
یاد آئی جب تیری جالی کی ٹوپی تب وہیں
عاشقِ رُسوا نے بس اپنے لپیٹا سر سے دام
قدر اُن کی کیوں نہ ہو پیشِ بتانِ سیم تن
ہاتھ لگتے ہیں عزیزو ان کو اہلِ زر سے دام
ہے قصورِ فہم آشفتہ دلاں یہ سربسر
جو لیا چاہیں ہیں عاصی کاکُلِ دلبر سے دام

آنکھوں پہ میری شوخِ پریزاد کے قدم
سر پر مرے دلا ستم ایجاد کے قدم
بیشک بنے وہ رشکِ گلستاں ، اگر کبھی

لاکھ سکاں ہیں عاشق آزاد کے قدم
زنہار اس نے ہاتھ اٹھایا نہ ظلم سے
سو بار چومے صید نے صیاد کے قدم
جاتے ہیں خیر آج تو، دیکھیں گے آکے پھر
کل ہم مطابق آپ کے ارشاد کے قدم
یاد آگیا یہ مطلع عاصی پھر اے صبا
گلشن میں جب گئے دل ناشاد کے قدم

دیکھے گر اس صنوبر آزاد کے قدم
قمری نہ چومے پھر کبھی شمشاد کے قدم
عاصی غزل نہ اپنی ہو کیوں خوب سربسر
پیشِ نگاہ رکھتے ہیں استاد کے قدم

تجھے دیکھیں ہیں اے دل غنچہ ساں دلگیر اکثر ہم
ہُوا کیا رنگ پاتے ہیں ترا تغییر اکثر ہم
کریں گے شوق سے خط یار کو تحریر اکثر ہم
لکھیں گے شوق سے حالِ دِل دلگیر اکثر ہم
جواب آوے نہ آوے لیک پیغام وسلام اپنا
یہاں سے بھیجیں گے سوئے بتِ بے پیر اکثر ہم
عمل اپنا نہیں چلتا ہے ہرگز اس پری پر
کریں تجھے ورنہ پریوں کو ولا تسخیر اکثر ہم

قطعہ

یہ تجھکو یاد ہوگا کس قدر تاکید کرتے تھے
برائے ترکِ عشقِ عاشقِ بے پیر اکثر ہم
وے تو نے نہ مانا اور وہی پیش آگیا آخر
جو کچھ کہتے تھے تجھ سے اے دلِ دلگیر اکثر ہم

اگر ہاتھ آئے اپنے خاک پائے یار سیمیں تن
بنایا پھر کریں عاصی یہاں اکسیر اکثر ہم

ناسورِ جگر پر نہ لگاتا کوئی مرہم
رستے سے ہُوا بند تو بس جائینگے مر ہم
دکھلاتے ہیں آج اس لئے یہ داغِ جگر ہم
فرماتے تھے کل آپ کہ چیرینگے سپر[1] ہم
روتے تھے اسی دن کے لئے لختِ جگر ہم
آنکھوں سے نکل کر ہُوئے تم بر ہم و در ہم
دروازہ سے بیٹھے ہیں لگا کر تیرے سر ہم
اے خانہ خراب اُٹھ کے بھلا جائیں کدھر ہم
طوفان سمجھتے تجھے گر دیدۂ تر ہم
تو سایۂ مسجد میں نہ رہتے کبھی گھر ہم
دانہ کے عوض دام میں ہاں شام و سحر ہم
منقار سے بس کھاتے ہیں نوچ اپنے ہی پر ہم
قاتل ترے کوچے میں کریں کیوں نہ گذر ہم
جاتے ہیں سدا رکھ کے وہاں ہاتھ پہ سر ہم

---

[1] زور سے تلوار ماریں گے ، کہ ڈھال بھی کٹ جائے ۔

اس پہلو میں خنجر ہے ادھر تیر ہے عاصی
لے سکتے ہیں کروٹ نہ اِدھر ہم نہ اُدھر ہم

جستجو میں پڑ کے اس کی آپکو روؤ گے تم
دل تو کھو بیٹھے ہو ظالم جان بھی کھوؤ گے تم
جاگ جائیں گے عدم کے خواب سے بختِ سیاہ
جس گھڑی بر میں ہماری آن کر سوؤ گے تم
تب یہ شاخِ آرزو برلائے گی نخلِ مُراد
تخمِ اُلفت کشتِ دل میں جب مرے بوؤ گے تم
گر یہی طوفاں رہے گا تو یقیں ہے ایک دن
زندگی سے حضرتِ دل ہاتھ ہی دھوؤ گے تم
اور جو کہتے ہو بہ تبدیلِ قوافی تم غزل
تو میاں عاصی مقابل اسکے پھر ہوؤ گے تم

ہمسر سو مذکور اِس ڈھب کا اگر لاؤ گے تم
تو دلِ وحشی کو پھر چیٹک[1] لگا جاؤ گے تم
الکسانے سے تمہارے تو یہ حالت ہے مری
کیا غضب ہوگا میاں جب یاں سے اٹھ جاؤ گے تم
خون کا عیوض مرے ہو کر رہے گا، دیکھنا!
حق نے چاہا تو حنا سے ہاتھ بندھواؤ گے تم

---

[1] فکر، بے چینی

تیسری بحر و قوافی کو بدل رنگیں غزل،
اَور بھی اے میری جاں عاصی سے پڑھواؤ گے تم

گر آج بھی آؤ اے صنم تم — تو کیا کیا نہ پائیں عیش ہم تم
گر یاد کرو ہو دمبدم تم — پھر کس لئے دو ہو مجھکو دم تم
آئینۂ دل کو گر ہمارے — دیکھو تو نہ دیکھو جامِ جم تم
آؤ گے نہیں، کرو نہ وعدہ — کھاؤ نہیں جھوٹی اب قسم تم
عاصی غزل اَور اِک سنادو
مت ہاتھ سے رکھیو تک قلم تم

غنیمت ہے کہ جو مِل بیٹھے ہیں یہاں ہم تم،
کہاں یہ بزم کہاں ساقی اور کہاں ہم تم
چمن سنبھال لو اپنا کہیں ہیں بلبل و گلُ،
چلے ہیں یاں سے سفر کرکے باغباں ہم تم
ہنر دکھاتے ہیں اپنا یہ تمکو دیکھو تو
کٹا کے سر کو دکھاتے ہیں شمع ساں ہم تم
کہیں ہیں محنت دل اشکوں سے دیکھکر کاجل
اب آؤ شام ہوئی بس رہیں یہاں ہم تم
غضب یہی ۔ ہے وہی ضد کی بات کرنے لگے
کہ بیٹھے پاس تمہارے ذرا جہاں ہم تم
یہ قولِ حضرتِ اُستاد ہے میاں عاصی
مشاعرہ وہ نہیں ہے، نہ ہوں جہاں ہم تم

آ کے عدم سے لالہ نمط اس چمن میں ہم

صد داغ تازہ پاتے ہیں زخمِ کہن میں ہم
دیتے ہیں برگِ پان جو اسکے دہن میں ہم
سلطانِ سبزہ وار کو لائے چمن میں ہم
لاغر بس تھے چھپ گئے تارِ کفن میں ہم
جائے لحد ملی تو نہ پائے کفن میں ہم
خوں کردہ چشم آبلۂ پا ہے خارِ دشت
کیا گل کھلا رہے ہیں نیا خشک تن میں ہم
کہتے ہے ترکِ چشم سے مژگانِ آبدار،
مثلِ سنان کیو ہیں جنگِ پشن میں ہم
دن رات ہم جلیں، یہ جلے رات بھر مدام
اے گل بڑی یہ شمع سوئی یا جلن میں ہم
دریا یہ جب سُنا کہ وہ غیروں کے ساتھ ہے
عاصی تڑپ کے رہ گئے مچھّی بھون[1] میں ہم

زلف و خط کیوں نہ بگاڑیں دلِ ناکام کے کام
ہائے گسترده ہیں وہ شوخ کے اندام کے دام
دل کا دل چھین لیا، بوسہ کا بوسہ نہ دیا،
مال کا مال لیا، اور لئے دام کے دام
دوش[2] اُلٹا مجھے دیتے ہو، یہی ہے انصاف
کیا نہیں ہم نے کیا سنتے ہی احکام کے کام

---

[1] ایک حویلی کا نام، جو دریا کی مناسبت سے بھلا معلوم ہوتا ہے
[2] جھوٹا الزام

اب بپھرتے ہو عبث حضرتِ دل بوسہ پر
ہو چکے پہلے تو گیسوئے دلارام کے رام[1]

یک قلم حرفِ محبت یہ اٹھایا دل سے
کبھی خط بھی نہ لکھا عاصیٔ بدنام کے نام

کہہ چلا دل سے ہمارے ہائے کیا پیغامِ غم
کر گیا برسے جو آہو کی طرح آرام رم

شرمساری کو سمجھ کر حاصل نام آوری
جیسے سا طبع نگیں کھینچے ہے بہر نام نم

کچھ سمجھتے بھی ہو میں بیمارِ چشمِ یار ہوں
مجھکو مت دوا سے عزیز و کرکے دو بادام دم[2]

گردشِ پیمانۂ چشمِ صنم دیکھے اگر
توڑ ڈالے پھر سرِ خجلت سے اپنا جامِ جم[3]

اب یقین مجھکو ہے اسے عاصی کہ وہ بیگانہ خو
کر سکے ہے تجھ سے کب مثلِ غزالِ رام رم

لیتا سدا رہا ہوں خطِ گلرخاں سے کام
ہوں طوطیٔ چمن ہے مجھے بوستاں سے کام

نوکِ مژہ کو یوں ہے خمِ ابرواں سے کام
ناوک کو جیسے شست تلک ہو کماں سے کام

---

[1] رام - مطیع [2] بادام پڑھکر پھونکے جاتے ہیں، اور بیمار کو دیئے جاتے ہیں۔ [3] جمشید

کہتے سے جو کسی کے نہ سمجھے، نہ آپ سے
ڈالے خدا کسی کا نہ اس بدگماں سے کام
مطلب رکھوں ہوں ذات سے ممدوح کی فقط
جاہل سے کچھ غرض، نہ کسی نکتہ داں سے کام
مشہور سچ مثل ہے یہ عاصی جہان میں
کیا کام ان کی باندی سے جن کے میاں سے کام

دم دے کے مجھے دام میں لایا نہ کرو تم
یا قید سے ہستی کی چھڑایا نہ کرو تم
آئینہ کو منھ اتنا لگایا نہ کرو تم
حیرت دل حیراں کی بڑھایا نہ کرو تم
ساتھ اپنے ہمیں یا تو سلایا نہ کرو تم
سوتے ہو تو منھ اپنا چھپایا نہ کرو تم
اتنا شبِ فرقت میں ستایا نہ کرو تم
دل لینا ہے تو آنکھ چرایا نہ کرو تم
اتنا بھی تو نظروں سے گرایا نہ کرو تم
دل خاک میں عاشق کا ملایا نہ کرو تم
اس دل کے پھنسانے کے لئے زلفِ گرہ گیر
شانہ سے سرِ شام بنایا نہ کرو تم

اگر مرادِ دلی دے مجھے خدائے کریم
تو میں لکھوں تجھے راجہ کرن ہفت اقلیم
ذرا سی جلوۂ باری کی تجھ میں دیکھ جھلک

کھڑے ہیں جن و بشر سر و قد پئے تعظیم
تو اپنے ابر کرم کو جو اذنِ رحمت دے
کرے گدا کو غنی دے کے خرمنِ زر و سیم

قطعہ

نہ سمجھو شمس و قمر جب وہ ہسی خانہ سے
کرے ہے سفرۂ نعمت کی اپنے گھر تقسیم
برائے پیر فلک صبح و شام بھیجے ہے
پلاؤ زردے کے بھر کر طباق از زر و سیم
اِسی لیئے کہیں مشقِ ستم کو چھوڑ دیا
بُتانِ ہند نے عاصی کو جان حرفِ جیم

ردیف ن

جب ہُوا روشن کہ وہ کھیلے ہے اکثر گولیاں
بن گئے اختر فلک پر تب سراسر گولیاں
کب یقیں آتا ہے دل کو تو نہ جبتک آئے پھر
تجھ سے قسمیں ہم نے اب اے ماہ پیکر گو، لیاں[1]
خانہ جنگی کس سے ہے منظور جو اے خانہ جنگ
ہاتھ میں رکھا تپنچہ تو نے بھر کر گولیاں
ساقیا لا شیشہ اور دارو شتابی بھی یہاں
ابر برساتا ہے ژالہ کی زمیں پر گولیاں

---

[1] دیہاتی بولی میں قسمیں لیں کی بجائے، قسمیں لیاں

گولیاں تجھکو کبابوں کی جو خوش لگتی ہوں، تو
دل کا قیمہ کر بناؤں اے ستمگر گولیاں
جو کوئی بوسہ لب شیریں کے تل کا تیرے لے
مُنہ لگیں اس کے اندرسے[1] کی نہ دلبر گولیاں
طفلِ بازیگر کی کیا افسوں گری عاصی کہوں
ایک کی اس نے دکھا دیں دو بنا کر گولیاں

جس طرح آج تو آیا صنما تیسرے دن
اس طرح آئیو پھر پھر خدا تیسرے دن
تیرے رنجور کو دیکھ آج یہ کہہ اُٹھے طبیب
دوسرے روز یہ مر جائیگا، یا تیسرے دن
کچھ سبب ہے جو نہیں تین مہینے سے ملا،
ورنہ مل جائے تھا وہ آکے دلا تیسرے دن
آپ جاتے ہیں کہیں روز کہیں دوسرے روز
خیر ہم سے بھی مِلا کیجے ذرا تیسرے دن
دو دن اُمید میں کاٹے ترے رنجور نے پر
دردِ ہجراں سے وہ بیچارہ نہ ہوا تیسرے دن
وعدہ یہ تھا، کہ مکرّر ترے پاس آؤں گا
اپنے گھر تجھکو بلاؤں گا میں یا تیسرے دن
کیجے اب وعدہ وفا یعنی ملاقات سے ہاں!
رکھیے محروم نہ عاصی کو ذرا تیسرے دن

---

[1] اندرسہ کی گولیاں - ایک مشہور مٹھائی جو ساون بھادوں کے مہینوں میں خاص طور پر بنتی ہے

عرضِ حال اے دوستو اس دلستاں سے کیا کروں
جب وہ آتا ہی نہیں چلتی نہ زباں کو کیا کروں

کام کچھ دُنیا سے ہے، ہم کو نہ مطلب دین سے
تارک الدنیا ہُوں میں دونوں جہاں کو کیا کروں

دل تڑپتا ہے سدا فرقت میں یہ اس ماہ کی
آہ وہ جانے نہیں اس خستہ جاں کو کیا کروں

کچھ اثر ہوتا نہیں دل میں بُتِ بے پیر کے
کھینچ کر سو بار اِن آہ و فغاں کو کیا کروں

جب تلاشِ یار میں سر اپنا چکرانے لگا
کھا گیا چکّر زمانہ آسماں کو کیا کروں

رام تو ہوتا نہیں عاصی صنم اپنا کبھی
پر ستاتا ہے مجھے اس دل تپاں کو کیا کروں

نہ اُٹھے درد ہرگز اے دلِ دیوانہ پہلو میں،
اگر بیٹھے ہمارے آن کے جانانہ پہلو میں

نہ دل ہے اپنے پہلو میں نہ وہ جانانہ پہلو میں،
بجائے دل کیا ہے درد نے کاشانہ پہلو میں

کوئی کہہ دے کہ جب سے تو نہیں جانانہ پہلو میں
مرے ہے درد کے مارے دلِ دیوانہ پہلو میں

جگر بھی پھر قطعہ رکھتا نہیں کاشانہ پہلو میں
رہے ہے جھومتا اک اور بھی مستانہ پہلو میں

خدا کے واسطے کر رحم اتنا ہم کو مت ترسا
قفس میں کے رکھ ذرا صیاد آب و دانہ پہلو میں،

نہ رہنے دیتے یاں تجھکو اگر ہم جانتے اے دل
کریگا دشمنی ہم سے بنا کر خانہ پہلو میں
بھروسہ آشنائی کا ترے ہو شعلہ رُو کس کو
کرے جا گرم ہر شب جب ترے بیگانہ پہلو میں
بھلا کیا خاک پھر بادہ کشی کی ہو وے کیفیت
وہ میکش گر نہ ہو اے عاصیؔ مستانہ پہلو میں

وہ دُردانی بچہ رکھتا ہے گوہر دونوں کانوں میں
کرے ہے سب کو دُر دُر[1] دُربین کر دونوں کانوں میں
صدف میں آج تک یاقوت اور مرجاں نہ دیکھے تھے
سو دیکھے یار کے گلہائے احمر دونوں کانوں میں
نہ کانوں سنے لگا ہر ایک کو مانند گوہر کے
جگہ دے پند کو میری تو دلبر دونوں کانوں میں
ہوئے ہالہ نشیں اب آفتاب و ماہِ تابندہ
ترے بالے ہیں یا اے ماہ پیکر دونوں کانوں میں
عجب کیا جو تری محرابِ ابرو کے سدا آگے
موذن دے اذاں انگشت رکھ کر دونوں کانوں میں
تو سچ کہہ کہ دونوں شخص تھے وہ کون جو شب کو
کہیں تجھے باتیں کچھ ترے ستمگر دونوں کانوں میں
مزا ایک آنکھ سب کو دیکھنے کا دور بیں دیکھا
گنے جانے لگے رنجیت[2] و ہلکر دونوں کانوں میں

---

[1] دُر دُر کرنا۔ دُور ہٹانا۔ دُھتکارنا [2] مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ٹھکر مرہٹے۔

جو کوئے عشق میں اُس شوخ کے جوگی بنے عاصی
رکھے مُندری بھلا اپنے نہ کیونکر دونوں کانوں میں

بیکلی ہے کیا مجھے غنچہ دہن کی فکر میں
ہے پریشاں دل بھی زلفِ پُرشکن کی فکر میں
جل تو اے پروانہ شمعِ انجمن کی فکر میں
تو نہیں محتاج کچھ گور و کفن کی فکر میں
ہرگز اے دل دیکھنے کا تو نہیں رُوئے یہی
گر رہے گا روز و شب سیبِ ذقن کی فکر میں
غم سے ہجراں کے نہیں دل کو ذرا تاب و تواں
اور نہ آنکھوں میں ہے خواب اس سیمتن کی فکر میں
حضرتِ دل غنچہ ساں سر در گریباں کیوں ہو پھر
گر نہیں ہو تم کسی گل پیرہن کی فکر میں
ہے غذا عاصی کی بس خونِ جگر اسکے سوا
کھانا پینا چھٹ گیا اس گلبدن کی فکر میں

گالیاں شوق سے دے صبح و مسا ہوتی ہیں
مجھ سے پر اور نیا سانگ نہ لا ہوتی ہیں
زیبِ بر اپنی تو کر سُرخ قبا ہوتی ہیں
آپ کو غیرتِ گلزار بنا ہوتی ہیں
مل کے رخسارۂ گلرنگ سے تو اپنے گلال
ہی ڈھنگ سے تک جلوہ دکھا ہوتی ہیں
کیا گلہ پہلے جو ہوتی تھی سو ہوتی لیکن

آتشِ ہجر سے مجھکو نہ جلا ہوئی ہیں

قطعہ

ساتھ ہے دورِ قدح کے دفِ بربط دمساز،
اور مطرب بھی ہے یاں نغمہ سرا ہوئی ہیں
یک قلم عیش و طرب کا ہے مہیا ساماں
بس یہ تم آؤ، تو ہو خوب مزا ہوئی ہیں
یہ غرض شرطِ محبت ہے، کہ ہم بزم رہو
ہو نہ آغوشش سے عاصی کے جدا ہوئی ہیں

آ کے اس دارِ خراب آباد میں — رات دن ہیں ہم اُسی کی یاد میں
دل پھنسا زلفِ ستم ایجاد میں — رُوز و شب ہیں نالہ و فریاد میں
جو گیا کوئے بُتِ بیداد میں — پھر نہ آیا خانۂ برباد میں
کوہ ڈالا قبضۂ فرہاد میں — دشت مجنوں کے لکھا اسناد[۱] میں
تجھکو قمری عشق کی دولت مِلا — طوقِ گردن اُلفتِ شمشاد میں
ہیر نے رانجھے کی خاطر دوستو — چھاونی ڈالی ہے حسن آباد میں
خوں ہمارا چاٹتے ہی آگئی — آبداری خنجرِ فولاد میں
کچھ تو میری بات کا دیجے جواب — ہو تسلی دل کو جس ارشاد میں
سخت جانی سے نہ ٹوٹا دل مرا — آگیا خم کاردِ جلاد میں
سر کٹایا شمع کا خودی کی طرح — چل کے ہم نے مقتلِ جلاد میں
کون جانے تھا کہ چھیڑ دیگی قضا — جُوئے شیریں تیشۂ فرہاد میں
کھینچتے ہی زلفِ پیچاں کی شبیہ — آیا رعشہ ساعدِ بہزاد میں
ہجر ہی لکھا تھا کیا کلکِ ازل — سرنوشتِ عاشقِ ناشاد میں
مجھکو دکھلا کر بیابانِ جنوں — بولے یاں بستی تھی اپنی یاد میں

[۱] اسناد۔ منسوب ہونا کسی چیز کی طرف

کردیا آتش کو گلزارِ خلیل دخل کس کو ہے خدا کی داد میں
ساعدِ ستم سے ڈلوائی کمند وائے قسمت گردنِ آولاد میں
دل دیا عاصی پریرویوں کے ہاتھ
ہم نے آتے ہی مراد آباد میں

گر ہو عکس اندازِ خط وہ شوخ پُرفن آب میں
فلس ماہی ہو پرِ طاؤس گلشن آب میں
کب ہے با موجِ عرق رخسارِ پرفن آب میں
آگیا ہے شعلۂ وادیِ ایمن آب میں
صبحدم نہا وے اگر طفلِ برہمن آب میں
حلقۂ گرداب ہو زنارِ گردن آب میں
واہ فیضِ اشکِ چشمِ خونفشاں رحمت تجھے
دستِ گلچیں پنجۂ مژگاں گیا بن آب میں
کم نہیں ہے ماہئی بے خار سے دیکھو بغور
مژماں یہ عکسِ چشمِ شوخِ پرفن آب میں
طائرِ دل سے نہ اے موج تو باندھ ضد
بس ہے اک گرداب کا اسکو فلاخن آب میں
سوز و اشکِ غم سے عشقِ گلبدن میں مثلِ شمع
سر تلک آتش سے پُر ہوں تا بگردن آب میں
تھا وہ تفسیدہ کہ کرہی جاتا اک دریا کو جذب
ڈالتا گر ذرہ اپنی خاک مدفن آب میں
پھرتے پھرتے کھوج پر بیڑے غریقِ عشق کے
مردمِ آبی کے بھی تلوے گئے چھن آب میں

گر ہماری داستانِ بختِ برگشتہ سنے
خفتہ پائے موج سے پیدا ہو سن سن آب میں
کاوشِ محنتِ جگر مژگاں پہ کب ہے چشمِ تر
سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں
صدمۂ موجِ حوادث سے بگڑتا تب کوئی،
چاک پر گرداب کے اُترا نہ باسن آب میں؟
عاصیؔ تفتہ جگر کے خوفِ سوزِ نالہ سے
خیمۂ چرخِ کہن ڈھونڈے ہے مسکن آب میں

دل لگا تجھ سے ستمگر گالیاں کھاتا ہوں میں
تیرا کچھ شکوہ نہیں، اپنا کیا پاتا ہوں میں
نام جانے کا نہ لو جاناں تمہیں میری قسم،
جی نکل جاتا ہے جب کہتے ہو، گھر جاتا ہوں میں
دیر لگ جائے تو گھبرانا نہیں، لیف پکار،
اُلٹے ہی پاؤں چلا، ٹھہرے رہو، آتا ہوں میں
رازِ اُلفت کیا کہوں، کس سے کہوں، سنتا ہے کون
آگے اُسکے بات بھی کرتے تو گھبراتا ہوں میں
(ق) ایسی اکھڑ بات کہہ دیتا ہے ظالم لاجواب
دیکے دم ہمدم اُسے جب راہ پر لاتا ہوں میں
کچھ پتہ جس کا نہیں لگتا زمیں سے تا فلک
آپ اچھا بن کے چھٹ جاتا ہے غم کھاتا ہوں میں
بیٹھے جب ہے زلف کے سودے پہ تیرے طفلِ دل
تب اسے زنجیر دز کھڑکا کے بہلاتا ہوں میں

جاں مچلا بن گئے میرے تقصیر ہی مجھکو برا
وہ تو کہہ بیٹھے ہیں دس غیروں میں شرماتا ہوں میں
نقشِ حُب[1] کا ساتھ اپنے لے چلا ہوں صبر کر
شام تک تیری طرف کھینچے اُسے لاتا ہوں میں
بلہ رے عاصی صرافت کس لطافت سے کہا
سحر[2] قسم کا دور کر تیری قسم کھاتا ہوں میں

نہ پہنچے آتشِ گل سے ضرر زنہار دریا میں
نہ ڈوبے بلبلِ تصویر کی منقار دریا میں
اگر پڑ جائے عکسِ ابروئے خمدار دریا میں
تو پھر ہر موج سے چلنے لگے تلوار دریا میں
نہائے صبح جو وہ غیرتِ گلزار دریا میں
تو ہو شکلِ گلِ احمر ہمتو ایکبار دریا میں
اگر رو ڈالیں آنسو گرم ہم دو چار دریا میں
کباب سیخ ہو پھر ماہیٔ بے خار دریا میں
غریقِ عشق کا تیرے پتہ ہرگز نہ پائے گا
اگر غواصِ غم ہوں غوطہ زن سو بار دریا میں
نہ کیوں آرام سے تیریں محیطِ عشق میں سیدھے
چلے ہے تیر بھی سیدھا دمِ رفتار دریا میں
وہ بحرِ حسن مل جائے لبِ دریا اگر عاصی
چڑھا دیں کشتیاں منت کی پھر زرتار دریا میں

---

[1] تعویذ محبت
[2] قسم کا سحر "ق" دور کرنے سے سم (یعنی زہر) رہ جاتا ہے

ہے ترا دھیان مہ جمال ہمیں دوسرے کا نہیں خیال ہمیں
شاد کر مل کے مہ جمال ہمیں ہجر میں کر نہ پائمال ہمیں
اس کے توسن کی نعل کا ہے نقش نظر آتا ہے یا ہلال ہمیں
جز غم ہجر یار دنیا میں نہیں زنہار کچھ ملال ہمیں

قطعہ

جبکہ ہم نے یہ دلستان سے کہا چومنے دے تک اپنا گال ہمیں
گالیاں دے کے تب لگا کہنے دو گے کیا اپنی جان و مال ہمیں

غزل ایک اور بھی سنا عاصی
تیری خوش آئی بول چال ہمیں

کھائے اُس زلف کا خیال ہمیں ہائے ہے جان کا وبال ہمیں
سرو قد کر نہ پائمال ہمیں مل کے تو ہم سے کر نہال ہمیں
جس نے اک خلق کو کیا پامال اب پسند آئی اسکی چال ہمیں
اے جنوں سوئے دشت لے چلیے گھر سے زنجیر کے نکال ہمیں
پھر نہ معشوق کی رہی پروا، عشق میں جب ہوا کمال ہمیں
نشہ سے بادہ کے ہم اے ساقی دیکھ گرتے ہیں لے سنبھال ہمیں

تیغ ابرو وہ قہر ہے اِس کی
جس نے عاصی کیا نڈھال ہمیں،

یاد بھی کرتا نہیں یاد و ذرا مہ رو ہمیں،
عشق نے جس کے کیا بدنام اب ہر سو ہمیں
جب گلستاں میں نظر آوے نہ ہرگز تو ہمیں
پھر بھلا کس رنگ سے گل بھا دیں اے گل رو ہمیں

سخت حیرت ہے کہ یارو کیجئے اب کیا علاج
کر گئے بیمارِ غم وہ نرگسِ جادو ہمیں

جس قدر چاہو ستالو اب ہمارے دل کو تم
خوب ہم سمجھیں گے پر جس دن بلا قابو ہمیں

چارۂ بیماریٔ عشق آہ! کچھ ہوتا نہیں،
گو اطبّا رات دن دیں آن کے دارو ہمیں

پر ہمارے درد دل کا گر کرے تو کچھ علاج،
تو شفا بیشک ہو حاصل اے بُتِ دلجو ہمیں

جبکہ اے عاؔصی بغل میں ہو نہ وہ مہوش تو پھر
دل کو ہو کیونکر قرار آرام ہو کس رُو ہمیں

دلا ہم اور جاناں ایک ہی بستی میں بستے ہیں
ولیکن یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

میاں تم سچ کہو، ہے کیا ارادہ آپکے دل میں
بتاؤ یہ کمر کس واسطے اب آپ کستے ہیں

کہو کیا ماجرا ہے اسکے اب شام و سحر ہر دم
دُرِ شہوار اپنے دیدۂ تر سے برستے ہیں

اگر دو تین بوسہ دو دل و ایمان ہم دیں لیکر
تو یہ سودا زدہ سمجھے کہ ان مولوں بھی سستے ہیں

نہ چھو لو اپنے تم دستِ حنا بستہ پہ گلرو یو
ہمارے دستِ[1] گُل خوردہ بھی دیکھو گُل کے دستے ہیں

---

[1] جلے ہُوئے ہاتھ

فقط باندھیں ہیں کیا ہر پیچ ہیں دستار کے دل کو
پریشاں ہم کو کرتے ہیں وہ طرّہ جب اُڑتے ہیں
کبھی رستے میں ملتا ہے تو بس منہ پھیر کر ہمدم!
وہ ہمکو دیکھ ہنستا ہے، ہم اسکو دیکھ ہنستے ہیں
جہاں جاؤ وہاں دل چھین لیتا ہے وہ غارتگر
ذرا عاصی خبردار اب کہ لٹتے ہائے رستے ہیں

اُٹھ کے کوچہ سے ترے ہم نہیں جا سکتے ہیں
گو اُٹھاتے ہیں قدم دل نہ اُٹھا سکتے ہیں
طرفِ گریہ ابھی ہم چشم کو لا سکتے ہیں،
ایک طوفاں ابھی چاہیں تو اُٹھا سکتے ہیں
لوگ کب اسکو دلا راہ پہ لا سکتے ہیں،
اپنے روٹھے کو جو ہم چاہیں منا سکتے ہیں
آپ کی رمز کو سمجھیں ہیں ہم اے غنچہ دہن
چٹکیوں میں ہمیں کب آپ اُڑا سکتے ہیں
رابطے جو ہیں قدیم اپنے اور اُس کے ہمدم
نہ گھٹا سکتے ہیں کچھ اور نہ بڑھا سکتے ہیں
ضبطِ گریہ سے اگر دیدۂ تر چاہیں، تو
کوزہ میں بحرِ رواں کو ابھی لا سکتے ہیں،
آپ کے پاس یہ عاصی تو نہیں آسکتا
آپ جس وقت یہاں چاہیں تو آسکتے ہیں

یہ فرماتے ہیں وہ جس دم ہم اپنے گھر کو جاتے ہیں
تو پھر پہلو میں ہم دل کو نہیں زنہار پاتے ہیں

فراقِ یار میں کچھ ہم نہیں آرام پاتے ہیں
فغاں کھینچے ہیں، روتے ہیں عذاب و رنج اُٹھاتے ہیں

زباں پر رازِ عشق اپنی نہیں زنہار لاتے ہیں
عیاں ہوتا ہے وہ اتنا کہ جتنا ہم چھپاتے ہیں

تماشے دیکھتے ہیں ہمنشیں اور مسکراتے ہیں
فراقِ یار میں بیٹھے جو ہم آنسو بہاتے ہیں

وہ اتنا روٹھتے ہیں ہم سے جتنا ہم مناتے ہیں
غرض راہِ محبت پر نہیں زنہار آتے ہیں

گل اندا موں کی میں آنکھوں میں مثل خار ہوں ہر دم
لگوں ہوں اُن کے دامن سے تو وہ مجھکو چھڑاتے ہیں

یہ اپنی ضعف سے حالت ہوئی وقتِ خرامیدن
مثالِ نقشِ پا ہر ہر قدم پر بیٹھ جاتے ہیں

جو ہیں مشتاق اپنے شعر کے ہم ان کو اے عاصی
غزل اک اس زمیں میں اور بھی پڑھکر سناتے ہیں

رقیبوں سے وہ ہر شام و سحر نظریں ملاتے ہیں
اور اس عاصی کو جب دیکھیں ہیں تب آنکھیں چُراتے ہیں

نہیں آتے ہو گر پیارے تو پھر ہم جی سے جاتے ہیں
اِدھر غم ہم کو کھاتا ہے اُدھر ہم غم کو کھاتے ہیں

خطر کیا میری گردن پر جو تلوار اب لگاتے ہیں
میں جوہر آزماتا ہوں وہ تیغ آزماتے ہیں

یہاں تجھکو ہم اپنا جوہر ذاتی دکھاتے ہیں
تیری تیغ کے آگے ہم ہی تو گردن جھکاتے ہیں
دلِ سرگشتہ کو پھیرے وہ کرکر صید یوں بولے
مدام ایسا شکار اک زلف سے ہم مار لاتے ہیں
نہیں اُٹھنے کا دُنیا سے یہ رخصتِ زندگی جبتک
قدم کوچہ سے اسکے ہم کبھی اپنا اُٹھاتے ہیں؟
برنگِ دیدۂ ساغر نہ کیوں ہو چشم تر ساقی،
کہ میرے سامنے وہ غیر کو ساغر پلاتے ہیں

اہلِ معنی تیرے عارض کو صفا کہتے ہیں،
زلفِ پیچاں کو خمِ شامِ بلا کہتے ہیں
واہیں غنچوں کے دہن جانئے کیا کہتے ہیں
شاید اس گُل کو صبا صلِّ علیٰ کہتے ہیں
جیسوۂ شوخ جہاں بادہ کشِ اُلفت ہو
اس کو فردوس جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
مجھ سیہ بخت کو جاناں تیرے منہ پر اغیار
خال بتلاتے ہیں یا زلفِ دوتا کہتے ہیں،
موت اور زیست ہے عاصی کی بُتوں کے ہاتھوں
یا خُدا اس لئے اس کو بخدا کہتے ہیں

جگر میں آہِ سوزاں کا وہ کاشانہ رکھتے ہیں
غضب ہے پاس شیشہ کے ہم آتشخانہ رکھتے ہیں
جو کوہِ غم پہ روشن شمع بے غرضانہ رکھتے ہیں

رگِ خارا شرر سے وہ پر پروانہ رکھتے ہیں
چھڑی کیا سرو کی ہم ہاتھ میں جانانہ رکھتے ہیں
مرے ہیں تجھ پہ جب سے وضع آزادانہ رکھتے ہیں
خیال آنکھوں میں جب مژگاں کا اے جانانہ رکھتے ہیں
نمط نرگس کی تب انگشت پر پیمانہ رکھتے ہیں
بنے ہیں رند مشرب صحبتِ مستانہ رکھتے ہیں،
ہمیشہ پُر شراب عشق سے پیمانہ رکھتے ہیں
چُرا مت آنکھ ہم سے جام دینے میں، تو اے ساقی
یہ دو مردم ہی تو کیفیت مستانہ رکھتے ہیں
مِلا ہے جب سے ہم کو بوسۂ خالِ لبِ جاناں
دہن میں تب سے یار وہم سدا بہیدانہ رکھتے ہیں
عبث کرتا ہے ہم کو پند بے تاثیر اے ناصح!
حدیثِ عشق گوشِ دل میں ہم افسانہ رکھتے ہیں
لگن میں جو تری اے شمعرو محو تماشا ہیں
وہ ہرگز پردۂ فانوس کی پروا، نہ رکھتے ہیں
لگاؤ کیوں نہ ابرو کے برابر خال کاجل کا
عمل انگریز کا ہے، مہربن تیغانہ رکھتے ہیں
کرو ٹک رحم بے بال و پری پر اُن کی صیاد و
اسیرانِ قفس کو بھی کہیں بیدانہ رکھتے ہیں
کہو گے اور جو کچھ تاب و طاقت کے سوا دینگے
دل و جاں کا تو بوسہ کے عوض بیعانہ رکھتے ہیں
تیری کاکل کے سودائی سدا آباد جوں مجنوں
سدائے خانۂ زنجیر سے ویرانہ رکھتے ہیں

بتبدیل ردیف و بحر ٹھہری چھیڑ چھاڑ عاصی
قوافیِ مطلعِ رنگینِ استادانہ رکھتے ہیں

تیغِ ابرو کو وہ جس وقت عَلَم کرتے ہیں
دم میں صدہا سرِ ناشاد قلم کرتے ہیں

جب تصوّر ترا ہم دل میں صنم کرتے ہیں
عینِ شفقت میں مرے تب دیدہ نم کرتے ہیں

سیہ بختی بُت تو خط کو رقم کرتے ہیں
ایلو ہمرنگ کی دُونے ابھی ہم کرتے ہیں

وہ رقیبوں سے بہم قول و قسم کرتے ہیں
حق ہیں کیوں عاشقِ بیتاب کے سم کرتے ہیں

ٹُرپ[1] انگریز جب آواز ترنّم کرتے ہیں
بیٹھ رہتے کسی جا پر ہیں سو رم کرتے ہیں

بندہ خانہ میں وہ جس روز کرم کرتے ہیں
بندہ اپنا مجھے بے دام و درم کرتے ہیں

مرگ جلد آکے شفا دے کہ مریضِ غمِ ہجر
خاک اکسیر اسے چاٹ کے سم کرتے ہیں،

دیر سے کام نہ کعبہ سے ہمیں کچھ مطلب
ہم طوافِ خمِ ابروئے صنم کرتے ہیں

سُن کے شہرت مرے شعروں کی رقیبوں نے کہا
میاں عاصی کو بلاؤ، کہ ستم کرتے ہیں

---

[1] ٹرپ troop بگل

گریہ میں ابر و دیدۂ تر دونوں ایک ہیں
عاصی تڑپ میں برق و جگر دونوں ایک ہیں

صورت میں گرچہ فرق ہے پر دونوں ایک ہیں
بل کھانے میں تو زلف و کمر دونوں ایک ہیں

گاہے فراقِ رُخ ہے، گہے ہجرِ زلفِ یار
آفت زدوں کو شام و سحر دونوں ایک ہیں

سرگشتہ گرچہ مجنوں و فرہاد ہیں، مگر
دینے کو راہ عشق میں سر دونوں ایک ہیں

نسبت ہے اسکو تخت سے اور مجھکو خاک سے
دیکھا جو غور سے تو بشر دونوں ایک ہیں

جس نے کہ دل سے حرف دوئی کا اٹھا دیا
نزدیک اس کے سود و ضرر دونوں ایک ہیں

اس شمع رُو کے سوزِ الم کی لگن میں آہ!
پروانہ اور تفتہ جگر دونوں ایک ہیں

پیکِ صبا و مرغِ دل نامہ بر دلا!
چلنے کے ساتھ وقتِ سحر دونوں ایک ہیں

اس آشنائے بحرِ محبت کے عرق[1] میں
گرداب ناف شکل بھنور دونوں ایک ہیں

جنگل میں ہائے بہر گرفتارئ غزال
عاصی پلنگ و شیر ببر دونوں ایک ہیں

---

[1] پسینہ

کس طرح جائیں تجھ سے جُدا ہو کے ہم کہیں
ڈر ہے نہ دل سے دُور کرے تو صنم کہیں
ہر شب خطر ہے یہ دل سرگشتہ ہو نہ جائے
یارو اسیرِ کاکلِ پُر پیچ و خم کہیں
اے مست ناز بہرِ خدا آ تو ایک دن،
دل میں ہے یہ کہ پیجئے مے ہو بہم کہیں
ہمدم ہے تو ہی ہجر میں مت ہو جیو جُدا
پہلو سے میرے اے دلِ پُر درد و غم کہیں
تجھ بن نہ باغ میں، نہ لبِ جوئبار پر
لگتا نہیں ہے دل مرا تیری قسم کہیں
قالب سے نکلے جان الٰہی شتاب سے،
تا ہووے دُور ہجر کا رنج و الم کہیں
کیا کہئے عاصی اب کہ عجب تفرقہ ہے یہ
بن اس کے دل کہیں ہے، کہیں جان ہم کہیں

بُتوں کی باتوں میں ہم نے رکھائیاں دیکھیں
وفا نہ دیکھی ذرا، بے وفائیاں دیکھیں
بہت جہان میں دلبر ہیں، لیکن اے پیارے
کسی میں ہم نے نہ یہ دلربائیاں دیکھیں
یہ تم سے پوچھتے ہیں ہم، کہ عاشقو تم نے
لگا کے شوخ سے دل کیا بھلائیاں دیکھیں
ستارہ شب کو جو آہ شرر فشاں کا چھٹا،
تو ماہتاب پہ اُڑتی ہوائیاں دیکھیں

بُرا کہو ہو جو عاصی کو تم، یہ ہے فریاد
کہ تم نے اس کی بھلا کیا بُرائیاں دیکھیں

مانع مَیں اَور کچھ بھی تیرا یہ جبیں نہیں،
پر اک یہ شرط ہے، کہ سُنیں گے نہیں نہیں
نکلا ہے گھر سے اب وہ بُتِ نازنیں نہیں،
ملتا ہی ہم کو ورنہ وہ یارِ رو کہیں نہیں
ایسا نہ ہو، کہ واں بھی رہوں میں عذاب میں
روتا مجھے عزیزو۔ دمِ واپسیں نہیں
بتلاؤ ہے کون اہلِ ہنر جز زمینِ شعر
کوئی زمیں وہ جس پہ کہ چرخِ بریں نہیں
ایسا ہی ہم پہ ہوگا ستم، تو پھر ایک دن
یہ دیکھ لینا تم ہی نہیں یا ہمیں نہیں
انصاف یہ ہے، چاہیئے ہے تم کو میری جاں
ہاں ہاں تو سب ہے، لیک ہمیں سے نہیں نہیں
بعد از فنا بھی قبر میں حسرت یہی رہی
جز سایہ یاں بھی اپنا کوئی ہمنشیں نہیں

بولے، وہ یاں سے چل بے، پرے ہٹ، ابھی نہیں
بھولی مجھے وہ بات ہے کیا رات کی نہیں،
چھیڑا جو اُن کو مَیں تو خفا ہو کے یہ کہا۔
بس آج سے ہماری تمہاری ہنسی نہیں
قطعہ ملحیہ

بسترِ گل پر عزیز دصبحدم — دیکھتا کیا ہوں میں اِک خوابِ گراں
جھلملسی سے چادرِ مہتاب میں — جم رہا ہے اک عجائب ہی سماں
اُٹھتا جوبن دو گدرائی کچیں، — ایک چھریری سی چھلاوا دلستاں
مانگ وہ دل مانگ کے رستہ بتائے — زلف ... سرکش کمندِ عاشقاں
لشکرِ زنگ و حبش ہے دُو بدو — مشکِ تاتاری سے گوندھیں پٹیاں
کان دونوں پارہ ہائے نور ہیں — یہ صدف کو تابِ دریا میں کہاں
شاہ ہیں قربان پر چینِ جبیں — صدقے اس ابرو پہ تیغِ اصفہاں
مہرو ... ہیں اُسی عارض سے نور — یاد کر کے گلستان و بوستاں
کر کے دُر دُو گر ... دنداں دکھائے — بند ہوں لب سے لبِ لعلِ یماں
گشتہ کیونکر اس تکلم پر نہ ہوں — ہے خدا کی طرح گویا بے دہاں
عاصی اِن جھگڑوں سے کیا حاصل تجھے — اُٹھ کھڑا ہو کر ثنائے قدرداں

یعنی وہ نواب ہے دار احشم — رستمِ دستاں ہے جسکا سارباں
نورِ تخلص علی ہر جس کا نام — اسکو سب کہتے ہیں فخرِ خانداں
ذات میں اسکی ہیں نیکی کی صفات — ہم بھی کہتے ہیں اُسے جانِ جہاں
ایلو! ... آئی نویدِ زندگی، — اب تو گلشن میں صبائے مہرباں
عشرت و عیش و نشاط و خرمی — بردرِ دولت ہیں یاں شادی کناں
کذب بہتاں افترا باطل و دروغ — ہے تیرے اعدا کی تقریر بیاں
واسطہ باعث سبب موجب جہت: — کیوں نہیں ملتے گلے سے ہو میاں
عید کا دن جان کر روزِ سعید — دوست سے ملتے ہیں باہم دوستاں
جامِ مینا کی طرح ہر بزم میں — دیکھو ہے رسمِ بغلگیری عیاں
اس بہانے سے ہی لگ جاؤ گلے — تا کہ بر آدے مرادِ عاشقاں
تجھکو جمِ جم عید رمضاں ہو سعید — ہر گھڑی ہر لحظہ ہر دم ہر زماں

جو ہر نصرت ہو قبضہ میں تیرے ~ توسنِ اقبال رہو سے زیرِ راں
اُٹھنے میں ابر سیاہ بیٹھے تو کوہ ~ وہ شکوہ فیل ہے معجز بیاں
حاتم دوراں نے بھی سنتے ہیں آج ~ دستِ بخشش سے تیرے کی الاماں
اور رستم نے دیئے ہتھیار ڈال ~ دیکھکر دستی ترا گرزِ گراں
چُن کے باغ دہر سے تاریخ گل ۱۲۶۱ھ ~ صفحۂ دل پر منقش کر بجاں
اب کرو عاصی دُعائیہ پہ ختم
ہو مبارک تجھکو وصلِ خانداں ۱۲۶۱ھ

چمن میں اُس گُل کو دیکھ خنداں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
بنا ہے رشک بہار بُستاں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
تیری تجلی کو دیکھ اے جاں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
کمال بے خود ہیں اور پریشاں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
عجیب ہے عشوہ غضب ہے غمزہ طلسم باتوں میں کیا بلا ہے
کتابی صورت پہ جائیں قرباں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
جدھر تو جلوہ نما ہو ظالم رہے نہ صبر و شکیب مطلق
قرار ڈھونڈیں ہیں حور و غلماں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
نہ کل سے کل ہے نہ ہیں بیکل تمہاری کاکل کے بل پہ مہرو
اُلجھ رہے ہیں بدام و زنداں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
تمہاری چتون نے جن کو مارا پھرے نہ جیتے پھر اِس گلی سے
کئی بھٹکتے گئے ہیں بیجاں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
جسے مزا ہے تیرے سخن کا نہ بات شیریں لگے کسی کی،
لبوں کو چاہیں ہیں از دل و جاں ملک فلک پر زمیں پہ انساں
رکھیں ہیں مقدور کب پر یہ و تیرے مقابل ہوں حور و غلماں

عدم کو بھاگیں ہیں جھاڑ داماں ملک فلک پر زمیں پر انساں

تمہاری فرقت نہیں گوارا برنگ لالہ کے حالِ دل ہے
رکھیں ہیں سینہ پہ داغِ ہجراں ملک فلک پر زمیں پر انساں

حدیثِ عشقِ بتاں نہ سنتے تو صورتِ قیس کیوں اٹھاتے
صعوبتِ خار دشت حیراں ملک فلک پر زمیں پر انساں

لڑا نہ دیوے کہیں پہ نرگس چمن میں آنکھوں سے اسکی آنکھیں
اِسی لئے ہیں بچشمِ نگراں ملک فلک پر زمیں پر انساں،

وہ مطلع اب تو سنا دے عاصی کہ جسکی طرزِ دگر ہے ہر دم
کہیں تجھے خسرو سخنداں ملک فلک پر زمیں پر انساں

تیرے حضور ہی گدا و سلطاں ملک فلک پر زمیں پر انساں
کرم کا تیرے پڑھتے ہیں کلمہ ملک فلک پر زمیں پر انساں

تیری شجاعت سے مردِ میداں ملک فلک پر زمیں پر انساں
تیری سخاوت سے زیر داماں ملک فلک پر زمیں پر انساں

خیال طرز عاشقانہ چھوڑ و عناں کمیت قلم کی موڑ و
لگیں ہیں وصفِ خدیو گیہاں ملک فلک پر زمیں پر انساں

تو ہے وہ شاہنشہِ مظفر، فروغِ مہرِ سپہرِ اکبر
کہ ولایت پہ لائیں ایماں ملک فلک پر زمیں پر انساں

چو مہر و مہ صبح و شام کیونکر نہ خوانِ نعمت سے تیرے پائیں
ہیں آتشفی دو گردۂ ناں ملک فلک پر زمیں پر انساں

وفورِ ابرِ کرم سے تیری ریاض رضواں جو تازہ تر ہو
تو ہوں نہ یاد سحر کے خواہاں ملک فلک پر زمیں پر انساں

ڈرے لگاہ غضب سے شاید کہ خوف ہے تیری چاکری کا

کریں ہیں باہم جو عہد و پیماں ملک فلک پر زمیں پر انساں
جلوسِ نوروز کا تماشا درِ شہِ دیں پہ دیکھنے کو،
چلے ہیں بازمرۂ ندیماں ملک فلک پر زمیں پر انساں
نہ ہوتی دنیا میں کوزہ پشتی نصیبِ پیرِ ضعیف ہرگز،
اگر اٹھاتے نہ بارِ احساں ملک فلک پر زمیں پر انساں
ترا تصور بٹھا نا دل میں مثالِ آئینۂ سکندر،
تو لے پہنچے پھر آبِ حیواں ملک فلک پر زمیں پر انساں
وہ عدل تیرا عدیلِ کسریٰ کہ کھیلیں آپس میں شیر بکری،
بچھا کے شطرنج سوئے بستاں ملک فلک پر زمیں پر انساں
اکھاڑا اندر کا آجما ہے بجشن نوروز کیا سہیں ہے،
کہ دیکھیں ہیں عالم پرستاں ملک فلک پر زمیں پر انساں
کچھ ایک انجم شناس گردوں بتاتا بیت الشرف ہیں خود ہے
جبھی ہیں خوش طالعی پہ نازاں ملک فلک پر زمیں پر انساں
حباب آسا دے غلامی نہ کس طرح دل میں بھر کے چاہیں
تجھی سے عفو قصور عصیاں ملک فلک پر زمیں پر انساں
شہا تیرے معجزے کے قائل پڑھایا علم اور بنائے عامل
برائے تسخیرِ مہ جبیناں ملک فلک پر زمیں پر انساں
جلوسِ نوروز سن کے تیرا پھبن بدل کر چلے ہیں گھر سے
قبائے فیروزی و زر افشاں ملک فلک پر زمیں پر انساں
تفخنت فیہ کا اس میں جلوہ سما گیا آن کر جب اے دل
تو وحدتِ حق پہ لائے ایماں ملک فلک پر زمیں پر انساں
دعا پہ ختم سخن ہے شاہا، تجھے مبارک یہ روزِ نو ہو
رہیں ہمیشہ ترے ثنا خواں ملک فلک پر زمیں پر انساں

کرے جو داغِ تپاں سے عاشق بہارِ نارِ خلیل پیدا
تو ہوں تماشائے گل بداماں ملک فلک پر زمیں پر انساں
ڈبو کے سیل ستم میں یکسر دکھائیں اعدا کو تیرے عاصی
طلاطمِ موج بحرِ طوفاں ملک فلک پر زمیں پر انساں

پرتو فگن ہُوا جو وہ مہ پیکر آب میں
ابرو ہلال عید ہُوئے اظہر آب میں
تاثیر بختِ سبز سے مستوں کی ہو گیا،
ہر اک حباب ہے بُتِ مینا گر آب میں
لِ کرمیں کوئی لبِ ساحل ہنسے تو ہے،
کھلنے لگا جو تختۂ نیلوفر آب میں
یہ کاسۂ دل اب صفتِ ساز جل ترنگ،
نغمہ سرائے عیش ہے طرفہ تر آب میں
کس نے یہ بال دھوکے سکھائے کہ عکس سے
پھرنے لگے جو افعی غارت گر آب میں
دِل میں یہ آیا مردم آبی کے بیٹھئے،
زیر طنابِ موج بچھا بستر آب میں
سنتے ہی ذکر سبزہ خطوں کا کچھ ابکے سال
پوشیدہ آئینہ کے ہُوئے جوہر آب میں
جوشِ خوشی وہ ہے کہ پئے سیر عاشقاں
ہر بچّۂ نہنگ ہو بازی گر آب میں
فیضِ طلاطمِ مژۂ تر سے دیکھ لو
دُرّ اینوں کا ہے یہ رواں لشکر آب میں

اہلِ فریب ہوں گے نہ آسودہ حشر تک
ہوتی ہے موج بھی کہیں بحرِ شراب میں
اللہ رے شوقِ دید کہ وہ پیرِ خرچ بھی
دیکھے ہلالِ عید ہے جھک جھک کر آب میں
روئیدگی کے جوش سے ہو نخلِ آرزو
گر جائے تفتہ جاں کی جو خاکستر آب میں
عاصی غزل وہ شستہ و رفتہ سی اک سُنا
کرتی رقم ہے کلکِ صفا گستر آب میں

پڑ جائے کاش عکسِ رخِ دلبر آب میں
تو ہر بھنور ہو شکلِ گُلِ احمر آب میں
پر اُسکے فیضِ مدح سے ہر موجِ بحر بھی
اوراقِ دل پہ کرنے لگے مسطر آب میں
یعنی علی محمدؐ خاں وہ کہ جن کا لُطف
رکھتا ہے روز غنچہ صفت اخگر آب میں
قطعہ
تیری نگہ اثر کرے اپنا گر آب میں
گھُل جائے شاخِ موج سے پھر عنبر آب میں
سرسبز ہووے جوہرِ ذاتی کو تیرے دیکھ
رکھ دے اگر وہ سہو سے بھی جمدھر[1] آب میں
ڈورے چُھٹی جو چشم کو دیکھے تیری تو ہو
کشتیٔ مے کو بس مددِ لنگر آب میں

---

[1] ایک قسم کا خنجر

پڑ ہوگا فیضِ لطف سے تیری اب ایک دن
خالی حباب کا جو یہ ہے ساغر آب میں
پڑ جائے پرتوہ جو تیری تیغِ برق کا
مرجاں کا نخل جل کے ہو خاکستر آب میں
اللہ رے حفظ عدل کہ بہرِ محافظت
کھنچے ہے موج سے سدِّ اسکندر آب میں
کیا ہے عجب جو کنفِ حمایت سے تیری ہو
مچھلی کا فلس بہر مگر[1] بکتر آب میں
عاصی اب ایک مطلع رابع تو اور لکھ
ان قافیوں سے اور جو ہوں بہتر آب میں

ڈوبے بھلا نہ جان عدو کیونکر آب میں
دیکھے کبھی جو تیری سر[2] تو ہی شراب میں
تیرے ہی خوف و رعب سے جوں ماہیانِ بحر
ٹوٹے نہیں ہے تیر کا ہرگز پر آب میں

قطعہ

تسبیح تیرے نام کی ہر شیخ و برہمن
جپتے ہیں صبح و شام کھڑے رہ کر آب میں
برکت سے تیرے اسمِ معظم کی بحرِ لطف
ہر اک جوان و پیر ہے مقصد در آب میں

---

[1] مگرمچھ
[2] تلوار

گر نے اگر نہ ریختہ و گچھ کے گھر تو پھر
رہتی بنائے خام بھلا کیونکر آب میں
دیکھے صفا جو تکمۂ الماس کی تیرے
خجلت سے عرق ہو گرہِ گوہر آب میں

قطعہ

دریائے فیض کا میں بیاں تیرے کیا کروں
گِر جائے کاش بال و پرِ شپر آب میں
برکت سے تیرے فیض کی ہو جائے یہ اثر
نکلے وہیں وہ شکلِ ہما بن کر آب میں
بل بے سُبک روی تیرے توسن کی جُوں حباب
سُم ڈوبتا نہیں ہے چلے وہ گر آب میں
سُرخ و سفید دیکھ کے گل تکیوں[1] کو تیرے
کانپے ہے عکسِ شمس و قمر تھر تھر آب میں
نکلوں نہ بحرِ مدح سے کیونکر لگا کے ہاتھ
سیدھا ہی تیر جائے ہے شیر اکثر آب میں
عاصی دُعائیہ پہ قصیدہ کرو یہ ختم
آمیں کرے ہے طبعِ سخن پرور آب میں
جب تک کہ دیں مشابہتِ تیغ موج سے
گرداب کا یہ تب تلک ہو ساغر آب میں
عیدِ سعید تم کو مبارک ہو جب تلک
تب تک گہر میں آب ہو اور گوہر آب میں

---

[1] چھوٹے گول تکیے گال کے نیچے رکھے جاتے ہیں۔

حاسد کلیجہ تھام کے بس وہیں بیٹھ جائے،
سُن اِس قصیدہ کو صفتِ شکر آب میں

مشغول، نظم و جہات لایا یہ چرخِ فیروزہ فام تیسوں
سو گرم مدحِ خدا لگاتی رہی ہیں ہر صبح و شام تیسوں
شمار انگشت دست و پا اور نقوشِ نعل فرسِ زمیں پر
خمِ دو ابرو صفوفِ مژگاں بنے ہلالِ صیام تیسوں
بہشت رکن اور ثلاثہ ابزا بحور اشعار تیری دولت
کریں ہیں مداح در کو تیرے شہا ہمیشہ سلام تیسوں
نفی و اثبات امر نہی وحدو و چار اور چہ دہ صیغہ
بطرز رنگیں ہیں اِک جگہ پر کئے ہوئے اژدہام تیسوں
نکالنے دس دو دشمن نے باہر جو پانسوں سے تو نل یہ بولا
کہ اب رہے داؤ پر جو سر شمار ہیں لا کلام تیسوں
اُٹھا کے گھوڑے بساطِ دل پر جو کھیلے شطرنج باز اپنا
تو ایک شہ چال مات ہو ویں وہ پا کے مہرے تمام تیسوں
زبان اقلیم خط و خامہ مداد سیر ہفت بند کاشی
نہ جانتے قرطاس پر لکھے گر تو ہوتے پھر مستہام تیسوں
ملا کے نکشتر فرح میں لا اور اسکے بعد از فقی و عمرا
جو فرق ہو ان میں ایک مُو کا تو میں اُٹھا لوں کلام تیسوں
بہشت آٹھ اور برج بارہ شفق تمہ و مہر و ابر و شبنم
شمیم و باراں نخل اور گل خوشی کا لا کے پیام تیسوں
تیری حضوری میں آج کے دن جو زہرہ گا دے تو کیوں نہ آویں
علیحدہ ہو اپنے اپنے راگوں سے راگنیاں تمام تیسوں

لہ نل اور دمن کے پُرانے قصہ کی طرف اشارہ ہے جس میں چوسر کے کھیل میں دس دو بارہ پانسے ڈالنے پر کھیلے تھے۔ لہ شطرنج کے کھیل میں دو بادشاہ اور ۳۰ مہرے ہوتے ہیں، جن میں ہاتھی اور پیادے شامل

حواس عشرہ چہار عنصر سہ روح جسم و دل و جگر اب
دو چشم و گوش اور جہات ستہ تیرے ہیں بندے مدام تیسوں

زبان و خامہ دہان دلیت اور بنان دست و دوات و کاغذ
علوم چودہ ثنا میں تیری رہیں ہیں ہر صبح و شام تیسوں

دعائیں آٹھوں پہر کریں ہیں دسوں وسا اور بارہ رائیں
کہ تیرے عہدِ طرب فزا سے ہوئے ہیں مقصد بکام تیسوں

چہار سمت اور راس بارہ سما و ساتوں زمیں کے طبقے
ترے ہی انصاف معدلت سے یہ پا رہے ہیں نظام تیسوں

وہ ہیں شہنشاہ ملک افغان جنہوں جن کے وزیر و خاقان
بجائیں چوں روز ماہ فرماں مثال زاغ ظلام تیسوں

نہ پہنچا اس جا یہ فہم سینا نہ عقلِ اقلیدس ہندسہ داں
جو اس نے یورپ کو یہ پر بیاں دکھا دیں ضربِ سہام تیسوں

وہ عالمِ عالمِ حقیقت وہ کاشفِ معنیِ طریقت
خدا کے گھر سے ہو اس پہ رحمت ہی ایک کے زیر دام تیسوں

ہوا ہے سرزد وہ مطلع نو کہ جس کے طرز دگر سے ہر دم
کریں ہیں تحسین مدح خواں اب حروف مل کر تمام تیسوں

جو کاٹ راون کے تین سے بارہ دکھائے تیری حسام تیسوں
تو تیرے ہاتھ اس کی ترح خوانی کریں وہ مل کر تمام تیسوں

چھ راگ اکیس مورچھنائیں گرام تینوں یہاں بجائیں
سو تیرے قانون پر نہ ا ہیں جو چھیڑتے ہیں زمام تیسوں

ستارے سات اور آسمان نہ فرشتے چاروں مقربِ حق
یہ مدرکات آئے تیرے در کو سمجھ کے عالی مقام تیسوں

چہاردہ[۱۴] وصف اسپ جولاں و شانزدہ[۱۶] فیل کوہ پیکر
نہ ہمرکابی سے مُنہ یہ موڑیں نہ ہوں کبھی بدلجام تیسوں
صحابۂ اربع[۴] چودہ[۱۴] معصوم امام بارہ[۱۲] بدرگہِ حق ،
رہیں صفت اور ثنا میں تیری علی الدوام و مدام تیسوں
فقیر دس[۱۰] اور ایک کمبل[۱] گران میں حد شمار[۱۹] شامل
دکھا دے تمکو اسے حضرتِ دل کسی سے بے قرض دام تیسوں
دعا یہ کر ختم اِس سخن کے ہو روزہ داروں کو عید حاصل
قبول ہوں اُن کی یا الٰہی یہ صوم ماہِ صیام تیسوں
سرور و آرام و عیش و راحت اسے نشاط و طرب ہوں جبتک
کہ تب تلک ہر مہینے کے ہوں شمار میں صبح و شام تیسوں
جو ماہِ نَو سے شمار کیجے اُجیلی راتیں اندھیری راتیں ،
تو تیسوں دن کے ہیں یہ مقابل شمار میں صبح و شام تیسوں
اگرچہ سی[۳۰] پارہ دل ہوا بھی ولیک لذت سے زخم کی پھر
ہے بجوں تیغِ قتال ابرو کے دل نے ٹکڑے نیام تیسوں
خدا خدا کر کے ہنستے ہیں روزِ ماہ گزشتہ عاصی
بزورِ شمشیر جلد کر لے انھوں کی راتیں بھی رام تیسوں

متفرق اشعار

سحر یہ آئی سحر اور نیند کے وہ جوش میں ہیں
لِلّٰہ الحمد ! وہ غافل ہیں ، تو ہم ہوش میں ہیں

یاں تلک ضعف بدن سے دستو بیہوش ہوا ،

مغز سر کی جائے رکھتا پنبہ ہائے گوش ہوں

گھاس بھی تربت پہ میری جم کے ہو جاتی ہے خشک
تفتہ جاں وہ ہوں ، کہ بعد از مرگ بھی خس نوش ہوں

جنازے پر لگائے نخلِ ماتم میں بتاشے ہیں
یہ دنیا وہ جگہ ہے یاں موئے پر بھی تماشے ہیں

پھنسا کر اس صنوبر قد کے ہم نے شوق میں گردن
یہ پھل پایا ، کہ قمری کی طرح ہے طوق میں گردن

بل بے حسنِ یار تجھ میں ناز وہ ایجاد ہیں ،
دست کش نقشہ سے جس کے مانی و بہزاد ہیں ،

دیکھ کے لاغری مری سوچا جو دل میں تیغ زن
بولا پھر ہاتھ مل کے ہائے۔ وائے بر روزگارِ من

نگہ کب تک گریزاں تجھ سے رکھوں
گرفتارِ قفس پہلے ہی میں ہوں

جہاں کہ نقشِ قدم دیکھوں مہ جبیں کا میں ،
لب خیال سے بوسہ لوں اس زمیں کا میں

ہے داغ دل اس طرح مئے ناب سے روشن جس طرح چراغ گوہر ہے آب سے روشن

ہم کو تو دم دیتے ہو پر دم کھایا ہے اور کہیں
زلفیں چھوڑ کے بات نہ کیجیے دل تو پھنسا ہے اور کہیں
ہم سے ذرا آنکھیں تو ملاؤ کیوں گھبراتے جاتے ہو۔
گالوں کی سرخی منہ پہ کہے ہے بوسہ دیا ہے اور کہیں

جو دل بدلے کوئی ہم سے تو ہم شیشہ بدلتے ہیں
نہیں ہم عورتوں کی طرح سے کروا[1] بدلتے ہیں

مخمس

(برغزل سودا)

داغِ جگر سے لالہ نمط خوں طپیدہ ہوں
شبنم کی طرح بادِ صبا آب دیدہ ہوں
کارد باستخوان جراحت رسیدہ ہوں
نے بلبلِ چمن، نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
ہیں موسم بہار میں شاخِ بُریدہ ہوں

جُوں سایہ بر سے جانب دلبر رمیدہ ہوں
صد چاشنیٔ حنظلِ حسرت چشیدہ ہوں
مارا پڑا ہوں افعیٔ گیسو گزیدہ ہوں
نے بلبل چمن نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
ہیں موسم بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

مثلِ سرشک راز نہاں پر دویدہ ہوں
شکلِ حباب زیست سے دامن کشیدہ ہوں

[1] عورتیں کروا چوتھ کے تہوار پر کروا بدلنے کی رسم ادا کرتی ہیں۔

کیا جانئے کہ کون ہوں کیوں آفریدہ ہوں
نے بلبلِ چمن ، نہ گلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں

کٹتی ہے عمر حالتِ مستی میں صبح و شام
رہتا ہوں دامِ دخترِ رز میں پھنسا مدام
کیفیتِ وصالِ صنم ہے خیال خام
گریاں بشکلِ شیشہ و خنداں بطرزِ جام
اِس میکدہ کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

جائے گا کوئی مرگِ شہادت کو جب شریف
خنجر ہی کھا مرے گا تب اک عاشقِ نحیف
دل میں سمجھ ذرا رہِ صرافت جو ہے صریف
تیغِ نگاہِ گرم کا تیرے نہیں حریف
کشتہ ہیں کشتہ مژہ خوں چکیدہ ہوں

فرہاد نے تو عشق میں شیریں کے سر دیا
مجنوں تلاشِ ناقۂ لیلا میں گم رہا
یوسف کے غم میں رو کے زلیخا نے یوں کہا
کس سے کروں میں دعوئ دل جا کے اے خدا
دل وادۂ زلف رُخِ دلبر ندیدہ ہوں

یاں تک تو ہو گیا غمِ فرقت میں مضمحل
سونے میں ہاتھ ڈالوں تو مٹی ہیں آئے گل
کس نے کہا یہ تجھ سے کہ عاشق ہے تو نہ مِل
غافل ہے کیوں ترا مری پرسشش سے گوشِ دل
اے بے خبر میں نالۂ حلقِ بریدہ ہوں

نفرت رکھے ہے نام سے میرے وہ رشکِ ماہ
دردِ الم سے کیونکہ نہ ہو حالِ دل تباہ
اس کو خبر نہیں، کہ مرے کوئی بے گناہ
کب پوچھتا ہے کون، کہ کس پر ہے داد خواہ
خون ہزار جاں سے گریباں دریدہ ہوں

پہنچے نہ کوئی منزلِ مقصد کو رہ نورد
ہیہات دم کو لے رہے سب بھر کے آہ سرد
پایا ایک عاشقوں میں یہ عاصی ہی رنگ زرد
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقولِ درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

تیلیاں

مشاعرہ میں استاد شاہ نصیر کی غزل پر اعتراضاً شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اپنے تلمیذ بہادر شاہ کی غزل میں چند اشعار پڑھے، جس پر آئندہ مشاعرہ معرکہ کا قرار پایا۔ اور ذوق کی غزل پر عاصی کی غزل فائق رہی:-

اعتراضیہ اشعار

قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
یار کی چلون میں ہوں پائے مگس کی تیلیاں

پیرو مرشد یہ وہ چلون ہے کہ اس میں بے دریغ
باندھئے گر بندھ سکیں تارِ نفس کی تیلیاں

اے ظفر دل سے نکالو ان کی مژگاں کا خیال
آتشی شیشہ میں کیوں رکھتے ہو خس کی تیلیاں

دن دیوالی رنگ یہ بار اسبرس نے باغ میں
چُھپکے پتی رہ گئیں شاخ سرس کی تیلیاں
تیرے عاشق کو ہُوا تھا جب کہ یرقاں تب ہائے
زرد تو ہیں دیکھو میزابِ[1] بجس کی تیلیاں

مشاعرہ میں چھیڑ کی غزل

اعلیٰ کو خاک کیا کوئی ادنےٰ پہنچ سکے
ممکن نہیں، کہ بحر کو قطرہ پہنچ سکے
پہنچا زبان خار کو پانی کہ خشک ہے
گر تجھ سے چشم آبلۂ پا پہنچ سکے
موسیٰ کو جب نہ تاب تجلّیِ حسن ہو
کب ہاتھ کو تیری یدِ بیضا پہنچ سکے
آنکھوں میں آرہا ہے مرا جوں حباب دم
جلدی پہنچ، جو رشکِ مسیحا پہنچ سکے
چھوڑوں نہ روزِ حشر تلک میں، اگر مرا
دامن تلک اس کے دستِ تمنا پہنچ سکے
طوبےٰ کو ہمسری کا نہ دعویٰ ہو گر تو پھر
قامت کو تیری سروِ چمن کیا پہنچ سکے
کل شیخ جی ہرن کی طرح بھولے چوکڑی
سیدھی سڑک بھی چل کے نہ متھرا پہنچ سکے
عاصیؔ وہ تیلیوں کی غزل اب کرو رقم
جس کو نہ سلکِ گوہرِ یکتا پہنچ سکے

---

[1] میزاب۔ پرنالہ

پھونک دوں نالوں سے کیا وحشت عبث کی تیلیاں
بلکہ بے کر دامنِ کوہ قبس کی تیلیاں

ہوں اسیرانِ قفس کے خاک بس کی تیلیاں
سر بھی پٹکا ۔ پر نہیں ہلتیں قفس کی تیلیاں

گو کہ قندیلِ سخن گو منہ لبیا تو کیا ہوا
ڈھانچ کی تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

(ذوق کے مطلع میں قفس کی تیلیاں دیکھو اور غالب و مغلوب پر نظر کرو۔)

تختۂ کاغذ اٹھا لیتے ہیں صناعانِ دہر،
رکھ کے حوضِ آبِ ساکن میں ترس کی تیلیاں

(چوٹ کا شعر ہے۔ استعارہ بلکہ کنایہ جس پر معاصر شعرائے داد دی۔)

کنکھورا یہ نہیں ہے کیوں ڈراتے ہو مجھے
سینگری میں توڑ کر دو چار خس کی تیلیاں

کھینچ سلفہ پر دم قلیاں کشی او مست ناز
بھر کے شیشے میں ہے دو عطر حرص کی تیلیاں

لال کا پنجرا بنا لئے ہو تو عاشق کی لگاؤ
استخواں کے پائے اپٹی پے کی نفس کی تیلیاں

(معنی اس شعر کے بہت نازک ہیں کہ تمام جسم کام آ گئے۔ نیز نئی تشبیہ پیدا کی اور نیا مضمون نکالا۔)

ناقۂ لیلیٰ کی مہمانی کو جنگل دکھ آج قیس
خار دشتِ قیس اور کوہ ہوس کی تیلیاں

(چُن دکھ بھی درست آتا ہے)

دیکھ لو آ کر کہ رگہائے گلو میں اب مری
نیشتر ہیں تارِ انفاس نفس کی تیلیاں

(۴ بالفتح - وقت نزع سانس کا تیز ہونا۔)

سیر تو جب ہے جنوں گر اسکی چلون سے لگیں
نالہ ہائے عاشقِ بے دسترس کی تیلیاں

(۲ بمعنی مقدور)

---

۱ بالفتح - ہری گھاس جو جنگل میں خشک ہو گئی ہو ۲ مولی کا پھل۔
۳ بالفتح - اگرچہ فارسی اضافت ہندی کیساتھ جائز نہیں، لیکن اسم کے ساتھ جائز ہے

پھونکتے ہیں شیر کا منہ بعدِ مُردن اس لیئے } ۱۔ موئے تس۔ یعنی مونچھ کے بال
سم ہیں سب کے حق میں اسکے موئے تس کی تیلیاں } جو لبوں کے باہر کھڑے ہوتے ہیں۔

اس زمیں میں اور لکھ عاصی غزل جس میں نہ ہوں
پائے زنبور و پرِ بالِ مگس کی تیلیاں

دیکھکر ہر شعر میں میرے قنس کی تیلیاں } ۲۔ بالفتح۔ عقل سکھنا۔
گرد حسرت سے دبیں اہلِ جبس کی تیلیاں } ۳۔ بکسر اول و فتح ثانی۔ ناکس و بددل

کوچہ جاناں میں وحشت سے سدا کھاتے ہیں ہم } ۴۔ بضم اول۔ ایک جزیرہ ہے،
سنگ طفلاں تن پہ اور بید قرس کی تیلیاں } جہاں بید بہت پیدا ہوتا ہے۔

مسلخ صیاد حیرت میں قنارہ[۱] بند ہیں
جوہر آئینہ سے پائے مگس کی تیلیاں

وہ پری اپنے لیئے بنوائے گر شلوار بند
ہوویں مژگاں عاشقِ بے دسترس کی تیلیاں

سینک کو تنکا غلط ہے کہنا تیکے کو گبنا } ۵۔ شعرِ حریف کی تردید میں
بانس کی ہوتی ہیں جادو ئے نجس کی تیلیاں }

تیرے بحرِ حسن کو گر آنکھ اٹھا دیکھے حباب } ۶۔ بکسر اول۔ موج زند۔ بدلنا،
کردوں آسکی آنکھ میں موجِ بجس کی تیلیاں } متغیر ہونا۔

۱۔ قنارہ اس کو کہتے ہیں کہ تین لکڑیوں کے سرے باندھ کر چراغدان کی شکل میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ اور اس پر جانور کو لٹکا کر اس کی کھال کھینچی جاتی ہے۔ مرزا جلال الدین اسیر فرماتے ہیں۔

در مسلخے کہ دشنہ قصاب ناز ساخت
بند و قنارہ بر جگر غنچہ آئینہ

چشمِ قاتل ہے وہ افسونگر کہ اک پل میں دکھائے
تختۂ لالہ لگا خاشاک وخس کی تیلیاں

یہ نہیں ہے داغ دل کی وہ سپر جو دو کرو م
ہل رہے ہو کاتے کر سمتی ترنج کی تیلیاں

ٹ بالضم۔ ڈھال کو کہتے ہیں، اور سوتی ہوتی ہے۔

نیم کے تنکوں کا رکھتا ہے مفید اے جانِ من
رختہ ہائے گوش میں سنت دکھ سرمن کی تیلیاں

تو قلم کر ڈال لے کران کو اے زنگی پسر
ہیں تری مژگاں سے ہمسر یہ دلش کی تیلیاں

ٹ بالفتح۔ نیلی سیاہی کو کہتے ہیں۔ صاحب جہانگیر کہتا ہے۔

گوٹے والے کو بھی دیکھا ہے زری کے تھان میں
لے کے رکھتے ہیں صفائی کو جرس کی تیلیاں

گرمیٔ نالہ سے اے عاصی خطر ہے جل نہ جائیں
شمع ساں ہر ہچکیٔ تارِ نفس کی تیلیاں

تذکرہ

جس زمانہ میں یہ مباحثہ ہوا۔ حضرت ابو ظفر نے مولوی رشید الدین خاں کو لکھا، کہ ہندو کافر کی تعریف نہ کرنا۔ وہ خط مشاعرہ میں پیش ہوا اور سب شعرا نے اس کو تعصب قرار دے کر ایمانًا کہا، کہ عاصی کی غزل لاجواب و قابلِ تحسین ہے۔ اور ذوق پر فوقیت رکھتی ہے۔

نوٹ:۔ جو لوگ گذشتہ زمانہ کے شعرا کے حالات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں، کہ اُن کی حریفانہ کشمکش سے بزم مشاعرہ ہنگامہ زار بن جاتی تھی۔ اسی طرح ذوق اور عاصی کے مابین بھی مندرجہ صدر واقعہ پیش آیا۔ جس کا اندراج کسی تعصب اور جانبدارانہ حیثیت سے نہیں۔ بلکہ تاریخی لحاظ سے مناسب سمجھا گیا ہے، جو عاصی مرحوم کے حالات زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ردیف و

یہ آثار اجل سمجھو، جو پشت اے یار ٹیڑھی ہو
خطر ہے بے گماں گرنے کا جب دیوار ٹیڑھی ہو
نکالیں گے ترا ہم ایک دن بل یہ سمجھ رکھنا
نہ ہرگز ہم سے تو اے کاکلِ دلدار ٹیڑھی ہو
ذرا اندیشہ دَورِ چرخ پرخم کا نہیں لیکن
غضب ہے ہم سے گر چشم بتِ عیار ٹیڑھی ہو
بھلا کیوں آپ کو پامال کیجے اسکی اُلفت میں
کہ جس شوخ ستمگر کی دلا رفتار ٹیڑھی ہو
تو چشمِ غور سے دیکھ اے مہِ نو کا ہے کیا رتبہ
حقارت کیا جو پشت اے آئینہ رخسار ٹیڑھی ہو
مقررِ تیغ میں ہوتا ہے خم یہ بیشتر دیکھا
عجب کیا وہ نگہ گر اے دلِ افگار ٹیڑھی ہو
غزل اک اور بھی لکھ اس قوافی میں وے عاصی
ردیف اب اسکی سیدھی ہو نہیں زنہار ٹیڑھی ہو

نگاہِ شوخ گر تجھ پر دلا اک بار سیدھی ہو
تو پھر کچھ گروشِ طالع تری اے یار سیدھی ہو
کجی پہلے ہی ہو جس میں نہ وہ زنہار سیدھی ہو
بھلا کس وجہ پر شانہ سے زلفِ یار سیدھی ہو
تعجب کیا اگر تیغِ فلک یکدست جھک جائے
ہوائی سے مری جب آہ آتشبار سیدھی ہو

تیرا ہو چارہ گریاں آن کر جو وہ مسیحا دم
تو پھر الٹی ہوئی قسمت دلِ بیمار سیدھی ہو
لگے یوں دیکھ کر میری طرف کل آپ فرمانے
جو ہم سے گفتگو ہو وے سر بازار سیدھی ہو
کریں ہم بھی کو صدقے شاعری پر اسکی اے عاصی
صفائی شعر میں ہو جس کی، اور گفتار سیدھی ہو

بس آ سکے ہم آغوش گل اندام کہیں ہو
تا دل کو غم ہجر سے آرام کہیں ہو
اس دور میں یہ اپنی تمنا ہو کہ ساقی
باہم مرے لب سے ہی لب جام کہیں ہو
یارب نہ دکھانا مجھے وہ روز تو ہرگز
کہ میں ہوں کہیں اور وہ دلآرام کہیں ہو
ایسے بت ہرجائی سے کیا ملئے جو اے دل
چوں مہر سحر ہو کہیں، اور شام کہیں ہو
میں بھی ہوں طلبگار دل وجاں سے ہتھیارا
اک بوسۂ لب مجھ کو بھی انعام کہیں ہو
زنہار نہیں مجھکو سروکار کچھ اُس سے
اب اپنی بلا سے بت خودکام کہیں ہو
مت ہار گو چھیڑا ایسے تو عاصی کہ مبادا
پھر ہار گلے کا بت گلفام کہیں ہو

بلبلو عارضِ رنگینِ صنم گر دیکھیو

پھر طرف گلُ کی نہ زنہار نظر بھر دیکھو
رُو کشی ماہ درخشندہ کرے کس رُو سے
مہ ہے وہ چند ہے تاباں رُخِ دلبر دیکھو
طالبِ سیمبرِ غنچہ دہن شوق سے ہو
گانٹھ میں اپنی گر اے حضرتِ دل زر دیکھو
گر بہارے دلِ پُر داغ کی تم دیکھو بہار
پھر نہ سوئے چمنِ لالۂ احمر دیکھو
ہمسرِ ابرِ گہر بار ہے کیا دیدۂ تر،
رُو کش برق ہے میرا دلِ مضطر دیکھو،
غمِ فرقت سے گل اندام کے اے یارو آہ
سُوکھ کر خار بنا یہ تنِ لاغر دیکھو،
آفتاب اس میں سدا جلوہ نُما رہتا ہے
جامِ جم سے ہے سوا لو مرا ساغر دیکھو
دل لگی کا ہے کی دل ہی سے فقط پوچھو مل کر
ہم سے دل والوں سے دل اپنا ملا کر دیکھو
شوکت و شان سے کیا آپ کی کم ہو وے اگر
اپنے عاصی کو بھی صاحب کبھو آ کر دیکھو

رکھنا نوکر مجھے صاحب کو جو منظور نہ ہو
صاف کہہ دیجے کہ کھوٹی رہ مسطور نہ ہو
ملطفت گلُ سے صبا تو جو بمقدور نہ ہو
طائرِ رنگِ حنا رعم سے کافور نہ ہو
جب تلک جامِ صبوحی میں مئے نور نہ ہو

تب تلک رنج خمارِ بُتِ مغرور نہ ہو
بعدِ مُردن بھی لیے جاتے ہیں دل آبلہ ساتھ
توشۂ راہ ہمیں خوشۂ انگور نہ ہو
مجھ پہ اس دَور میں ہے ساقی مہوش کا کرم
کاسۂ فقر مِرا ساغرِ فغفور نہ ہو
دی ہے وہ نظمِ سخن کو مِری شہرت غم نے
شعر پُر درد ہو عاصی کا تو مشہور نہ ہو

مژگاں گئے سینے میں گڑ ایسے کہ نہ پوچھو
آئی رگِ جاں پر بگڑ ایسی کہ نہ پوچھو

سوزِ عشق تازہ یوں ہے اس دل افسردہ کو
آتشِ آب زندگی جوں ہوئے سرما خوردہ کو

صبر کہاں تھا ورنہ ہائے دیدہ انتظار کو
وعدۂ وصل نے مگر روکا کچھ اضطرار کو

خاک آئیں شبِ ہجراں ترے گھر کاٹنے کو
دوڑتے ہیں کھانے کو درباں، سگِ در کاٹنے کو
رات بھر تو پئے گلفام ہی پی اے ساقی!
رہنے دے تھوڑی صبوحی تو سحر کاٹنے کو
کس نے بہکایا اسے تیری طرف سے عاصی
پھرتا ہے کل سے جو قاتل ترا سر کاٹنے کو

شکرِ خار نے زخمی جو کیئے ٹوٹ کے پانو
چشمِ ہر آبلہ سے روتے ہیں پھوٹ کے پانو

جھوٹی باتیں نہ بنا اگر پڑیگا ٹوٹ کے پانوں
نامہ بر سچ یہ مثل ہے کہ نہیں جھوٹ کے پانو

سب رہے کھیت اسی کھیت میں مل کر قزاق
حیف ہے اٹھ نہ سکا قافلہ کو لوٹ کے پانو

ہاتھ ملتا رہا شب بھر ترا بیمارِ الم
آخرش مرگیا بستر پر سحر کوٹ کے پانو

چال انگریزی سکھائی تجھے کس نے عاصی
اک قدم بھی نہیں چلتا ہے بلا سوٹ کے پانو

قصیدہ در مدح مرزا محمد کامران

فلک پر قدسیوں کو کیوں نہ پیدا اک مسرت ہو
کہ باغِ دہر میں جب غنچۂ دل پر طراوت ہو

الٰہی چرخ پر جب تک درخشاں ماہ طلعت ہو
تمہارا غسلِ صحت صبحِ عیدِ شامِ عشرت ہو

کفِ گلگوں میں جامِ گل پُر از صہبائے اُلفت ہو
بغل میں حورِ جنت رشکِ بدرِ ماہ طلعت ہو

لکھا کلکِ شفا نے نسخۂ دل پر ہو شافی
کہ غم پر سینہ .... دانِ تابِ حکمت ہو

نہ کیوں سیراب تیرے قطرۂ آبِ طراوت سے
یبوست[1] ہو .... ہو رطوبت ....

[1] خشکی

تیری بزم طرب انگیز میں اے ساقیٔ مہوشش
ترقی پر ترقی ہو، مسرت پر مسرت ہو

تو وہ بحرِ کرم عالی ہمم ہے اس زمانے میں
نہ کیونکر دستِ بخشش سے تیری آسودہ خلقت ہو

چمکتا توسن اقبال رہوے زیرِ راں ہردم
سدا قبضہ میں تیرے بُرّشِ تیغِ شجاعت ہو

سناؤں زلف پیچاں کے وہ مضموں باندھکر یکسر
کہ کوندے برق شملہ زیب دستارِ فضیلت ہو

توکّل پر نظر آئے تو اس کے دستِ قدرت سے
طریقت ہو لطافت ہو فصاحت ہو بلاغت ہو

دُعائیہ پہ ہے ختمِ سخن یارو کہو، آمیں
رہے خوش دوست اسکا اور دشمن جو ہو غارت ہو

سنادو مطلعِ دیگر بطرزِ نو اب اے عاصی
خدا کے فضل سے تم آج دریائے صرافت ہو

یہ اورنگِ فلک تا خسروِ خورشید خاور ہو
قمر دستورِ اوّل، مشتری مہرِ سخاوت ہو

عطارد میر منشی زہرہ سرگرمِ نظارت ہو،
رہے بہرام بخشی اور زحل میرِ عمارت ہو

سرِ ہفت آسماں تا سبعۂ سیّارہ کو طاقت ہو
مبارک میرزا صاحب کو جب تک غسل صحت ہو

برائے آرزوے دل نہ کیونکر بلبل و گُل کی،
کہ نخلِ بے خزاں باغِ جہاں میں جب قامت ہو

درخشاں گنبدِ گردوں پہ جب تک مہرِ تاباں ہو
مبارک صاحبِ عالم کو ہمارے عید قرباں ہو

رہے جب تک کہ دنیا اور پانی گنگ و جمنا میں
بہو رنگ میرزا محمود دستم پر لطفِ یزداں ہو

کٹا دے ہاتھ سے یہ سیم و زر لعل و گہر اپنے
کہ اسکا نام مہر و ماہ سے صد چند رخشاں ہو

قدم رنجہ کرے ہودج طلائی پر یہ خود جس دم
تو مولا بخش فیل کو پیکرِ شیرِ غراں ہو

چلے اسکی سواری اس عمارت سے تہ گردوں
کہ ہر اک تختۂ بازار رشکِ صد گلستاں ہو

برنگِ برگِ پاں یاں آن کر جو منہ لگے اس کے
تو پھر کانِ زمرد وارثِ تاجِ بدخشاں ہو

عنانِ بخششِ غربا نوازی ہاتھ ہو اس کے
اسی کے ابلقِ ایام زیرِ ران جولاں ہو

یہ وہ ہے معدنِ جود و کرم ثانی ہم حاتم
کرے آباد دم میں شہر کیسا ہی بیاباں ہو

سحر ہو عید دن نوروز اور شام شبِ عشرت
غرض سب پاس اس کے عیش کا تیار ساماں ہو

پڑے جب نقابِ طبلہ پر تو یہ زہرہ جبیں گائے
مبارکبادئی عید الضحیٰ تمکو فراواں ہو

کفِ دستِ کرم میں رو نکٹے کیونکر بھلا جتنے
گئے ہیں دستِ قدرت میں ید بیضا نمایاں ہو

عطا خلعت جو فرمائے گئے بزمِ مبارک میں

تو ہر اک جسم انساں ہوگیا طاؤس رقصاں ہو
جواہر سیم و زر عاصی کو بھی بخشش ہوئے اتنے
کہ مالا مال ہوکر گھر گیا فرحان و شاداں ہو

درِ دولت پہ تیرے بہر بخشش اتنا ساماں ہو
کہ حاتم سن کے سُن[1] رہ جائے اور قاروں پشیماں ہو
کفِ عشرت میں جام گل پُر از صہبائے عرفاں ہو
بغل میں نازنیں اک گلبدن و رشکِ پرستاں ہو
کہو اس بزم میں کیونکر سماں باندھے نہ کیفیت
کہ جس جا بلبلیں گاتی ہوں اور طاؤس رقصاں ہو
چڑھایا چرخ پر ہے اس لئے ایزد نے ماہِ نو
وداعِ صوم ہووے تا نجاتِ روزہ داراں ہو
نکلتی اپنے منہ سے ہے دعا ہر وقت یہ عاصی
محمدؐ کامراں تجھ کو مبارک عید رمضاں ہو

آفتاب اقبال کا تیرے جہاں افروز ہو
اور برقِ تیغِ رخشاں تیری دشمن سوز ہو
توسنِ بادِ بہاری جاودانی ہو زیرِ راں
فتح و نصرت ہم عناں با طالعِ فیروز ہو
آگے دانائی کے تیرے اے خود آراستہ جہاں
پیرِ دہقاں طفلِ ابجد خوان نو آموز ہو
فہم سینا کیوں نہ زانوئے ادب کو تہ کرے
عقلِ اول جبکہ آکر تجھ سے شرف اندوز ہو

[1] متحیر ہو جاتا

یہ دُعا ہے چرخ پر جب تک رہے قوسِ قزح
سہمِ ترکش تیرا اعدا کے لئے دلدوز ہو
شام ہو رنگِ شفق تو ہو سحر دن عید کا
روزِ عشرت ہو مبارک روزِ نو، نوروز ہو
شاعری میں اُس کی ہی عاصی کچھ آتا ہے مزا
شعر میں جس کے صداقت ہو سخن میں سوز ہو

مسدس

مدح خوانِ شاہِ جہاں کے ہیں دل اور ہم دونو
طرب و عیش ہیں ہم دونو کے ہمدم دونو
کیوں نہ ہم دونوں سے بھاگیں الم و غم دونو
آپ سے دولت و اقبال ہیں باہم دونو
جاہ و حشمت ہیں ترے در پہ فراہم دونو
ہوں مبارک تجھے یہ نیّرِ اعظم دونو

تیرے وصفِ دُرِ دنداں میں تو اے قلزمِ جود
ہے زبانِ قلم عاجز بخداوندِ ودود
رشک سے لالہ و سوسن ہیں بنے زرد و کبود
سوزِ غیرت سے اٹھا آتشِ یاقوت میں دود
لبِ پاں خوردہ و دندانِ مسی زیب سے زود
گرد ہوں لعلِ بدخشانی و نیلم دونو

ہم سخن کس سے ہو تیرا سخنِ پاک نسب
لطفِ تقریر زہے، خوبیِ گفتار عجب
وجد کرتی ہے فصاحت بھی دمِ جنبشِ لب

دست بستہ ہے بلاغت بھی ستادہ بہ ادب
ایک سلطانِ عجم دوسری حسانِ عرب
رشکِ اعجاز کلامی سے ہوں ایکم دو نو

اُردئی فیضِ عدالت سے ذبیں ہے خوشحال
ہوگیا ہر ورقِ گل پہ غلط حرفِ زوال
بہمن و دے کو دیا ماہ چیلانی نے نکال
ہیں رطوبت سے یمِ عدل کی شاداب نہال
مے کے شاخ شجرِ موم سے تا شاخِ غزال
بار اثمار سے ہیں شکلِ کماں خم دو نو

مدح کیا فیل سیہ مست کی کیجیے مرقوم
یوں تنِ فیل پہ قطراتِ عرق کا ہے ہجوم
طے جو اک ڈگ میں کرے ہند سے تا وادئ روم
چرخِ نیلی پہ عیاں شب کو ہو جوں جیشِ نجوم
ہے فلک مثلِ خطِ قوس ہے رنگیں خرطوم
طور و البرز بلندی میں بھی ہیں کم دو نو

دونوں دندانِ خمیدہ دو مہِ نو یا ہیں
نیزۂ دو شاخہ رستم بصفِ اعدا ہیں
ایک شب سے دو سپیدائے سحر پیدا ہیں
کہ تہِ گنبدِ گردوں دو ستوں گویا ہیں
یا سپئے قتلِ عدو صورتِ حرفِ لا ہیں
طرفہ دندانِ سفید ایسے ہیں پُرخم دو نو

فرقداں وار خوش آیند ہے دم سے تا فرق
شرق سے غرب تلک غرب سے لیکر تا شرق

ایک چشمک میں کرے قطع نہیں اس میں فرق
صرصر و برق تہِ آبِ خجالت ہوں غرق
ہم عناں ہوں ترے توسن سے اگر صرصر و برق
ایک دو گام پہ تھک کے رہیں تھم دونو

ایسے خاوند کا یارب رہے اقبال بلند
ہو ہر اک دشمنِ بدخواہ زمیں کا پیوند
دوست اس کے رہیں اس باغ جہاں میں خورسند
آتشِ رشک میں جلتا رہے حاسد چوں سپند
اس کے شیرازۂ الطاف میں گر ہوئیں نہ بند
ورقِ ارض و سماوات ہوں برہم دونو

پنجۂ عشق نہ دکھلاتا جو زور آوریاں
شاخ آہو پہ کہاں پاتے مروڑے کے نشاں
یدِ قدرت سے یلا زور ہے عاصی کو میاں
لائے ہیں اس پہ سبھی عاشقِ صادق ایماں
بندِ مشکل جو پڑی دیکھی تو کردی آساں
آکے شاگرد ہوئے برزو و رستم دونو

ہو مبارک یہ دسہرہ تجھے اے عالی قدر
چرخ پر تا رہے رخشندہ چراغ مہ و بدر
حور و غلماں ہوں ثنا گو ترے یاں سے تا صدر
عقلِ کل لائے زباں پر نہ کبھی حرفِ عذر
کوہ و صحرا میں جو ہوں اژدر و ضیغم دونو
دبدبہ سے ترے تعقّت کے کریں رم دونو

غزل فارسی

مرا دردیست باقی اے دلِ دیوانہ در پہلو
ترا جا گرم ہر شب میکند بیگانہ در پہلو

ترا جا می کند ہر لحظہ یک بیگانہ در پہلو
مرا خوں می شود ہر دم دلِ دیوانہ در پہلو

تو خود انصاف کن اے آشنا دشمن روا باشد
مرا دردِ تو در پہلو ترا بیگانہ در پہلو

بیا زود اے خدنگِ ناز زآہ و نالہ می ترسم
کہ جائے تست بنشیند کسے بیگانہ در پہلو

بچندیں آشنائی کرد دل بیگانگی آخر
مبادا ہیچکس را آشنا بیگانہ در پہلو

رقیب تفتہ دل خوں گے بگرید بر وصالِ من
کہ می داریم عالم آشنا جانانہ در پہلو

برنگِ آشنائی کو تکلف آشنا نبود
خدنگش آمد و بنشست گستاخانہ در پہلو

دگر امروز جا گیر و نشت در پہلوئے من ناصح
مبادا ہیچ عاقل را ننگ دیوانہ در پہلو

برہمن دیدہ میخانہ و غم را ز شیخ بیت اللہ
ز فیضِ عشق دارم کعبہ و میخانہ در پہلو

اگر عاصی جفا از یار می بینی روا باشد
کہ می داریم عالم آشنا جانانہ در پہلو

ردیف ہ

صبا نے باندھی ہے غنچہ کی ایکی سالگرہ
سنا یہ جب کہ ہے جانِ جہاں کی سالگرہ

رہے جہان میں جب تک کہ رسمِ سالگرہ
لگاؤں رشتہ جاں میں ہزار سال گرہ

قدم قدم پہ ہٹاؤں میں اپنی بختِ سیہ
جو دیتی جائے ہے زلفِ شبِ وصال گرہ

نہ کیوں ہو درخ پہ نگہبانِ حُسن دانۂ خال
کہ رکھتے مرچ ہیں کافور میں مثال گرہ

یہ عقدہ مجھ پہ ذرا نامہ بر نہیں کھلتا
کہ مرسلہ ہیں یہ کس کے زرِ رسال گرہ

مری طرف سے قیامت تلک کھلے نہ کھلے
پڑی جو دل میں ترے شوخ بدخصال گرہ

کہے ہے مورِ ضعیف اپنا پیٹھ دکھلا کر
نہ دیکھی ایسی سلیماں نے بے مثال گرہ

گرہ سے ہلدی کی جو ہا نہ ہو گا پنساری
چُرا کے لایا کسی کی گاہ امتثال گرہ

ہماری اور پری وش کی گانٹھ جڑی ہیں
لگائی عشق کی کر قصہ انفصال گرہ

سعید ہو تجھے تب تک کو اکبِ گردوں
گرہ سے پاتی رہے جب تک اتصال گرہ

بشر کا کام نہیں ہے جوں عاصی شیدا
بجا کے ایسی جو باندھے تری مثال گرہ

مہ جبیں مڑ کے مت قمر کو دیکھ　　آپ کو دیکھ اور کمر کو دیکھ
زلف و رخسار سیمبر کو دیکھ　　شام کو دیکھ اور سحر کو دیکھ

مانی قلم کو پہلے تو تارِ نظر سے باندھ
پیچھے خیالِ نقشۂ زلف و کمر سے باندھ

کیا مسجد و میخانہ کیا کعبہ و بتخانہ
گر عشق نہیں ہو پیدا تو سب ہے یہ افسانہ

سلام

مجرئی رن میں نہ جھپکی جب علی اصغر کی آنکھ
اشک ریزاں کیوں نہ ہو پھر جوہرِ خنجر کی آنکھ
گرمیٔ تشنہ لبی غالب علمداروں پہ دیکھ
عدن میں کب چین پاوے فاطمہ اطہر کی آنکھ
بولے ہنگام شہادت رو کے بھائی سے حسین
کچھ پھڑکتی آج ہے بے وجہ مجھ مضطر کی آنکھ
حضرت عباس علی کا تیر باسانی کے وقت
سر کٹا پر روئے دشمن سے نہ ہرگز سر کی آنکھ
وائے رے حسرت کہ وہ سوتے کے سوتے رہ گئے
بن سلائے جن کے لگتی تھی نہ پیغمبر کی آنکھ
مقتدی شبیر کے تب تک نہوں دنیا سے کم

جب تلک سے ہو اچھلاہٹ میں غزال تر کی آنکھ
پارۂ الماس ویسے شبنم سے گل کو اے صبا
تا کھلی رہو گے غم حسنین میں عنبر کی آنکھ
جس کے نانا نے کیا انگلی سے دو ٹکڑے قمر
قتل سے اسکے نہ اک ذرہ پھری جدھر کی آنکھ
مرگئی پیاسی سکینہ پی کے آبِ زندگی
ڈبڈبا کر اشک پی جاوے ہے جوں اختر کی آنکھ
یا الٰہی تیرے عاصی پر سدا سیدھی رہے
حشر تک نگہِ کرم اور ساقئ کوثر کی آنکھ

ردیف ی

بسانِ مہر اگر پاس اپنے نور ہو جائے
تو پھر نصیب ملاقات بیمبر ہو جائے
اگر تو شب کو لبِ بام جلوہ گر ہو جائے
تو ماہ دیکھ تجھے محوِ چرخ پر ہو جائے
وفا و مہر سے ہرگز نہ ہووے دورہ اگر
ہمارے پاس تو اے غیرت قمر ہو جائے
نہ چمکے رات کو ہرگز ستارۂ برجیس
مقابل اس تیری بالی کا گر گہر ہو جائے
مجھی سے ضد ہے اگر کاشکے تو برسے ابر

کہیں نہ سبزہ ہماری بھی گور پر ہو جائے
یہاں تلک تنِ لاغر پہ لاغری کھینچوں
کہ دیکھ نبض مری بند ڈاکٹر ہو جائے
یہ تجھ سے پوچھوں ہوں اے شیشہ گر یہی وہ ہے
کہ جس کا ٹکڑے غم ہجر سے جگر ہو جائے
ترا یہ کشتۂ بتِ سنگ دل وہیں ہو دفن
بزیر سایۂ دیوار تیرے گر ہو جائے
جب اسکے دل میں کدورت ہو کچھ تو پھر کیونکر
وہ اپنے کشتۂ ہجراں کی قبر پر ہو جائے
دکھا دے اپنے تو پاں خود وہ گر در دنداں
تو برق چرخ پہ فی النار و السقر ہو جائے
دوا سے ہو نہ طبیبوں کی رفع بیماری
بن اس کے بلکہ یقیں ہے زیادہ تر ہو جائے
بغل میں آئے وہ آرامِ دل اگر عاصی
تو درد رنج و الم دور سر بسر ہو جائے

ایک مدت سے ترا پھرتے ہیں ہم گھر ڈھونڈتے
ہم ہی کچھ تنہا نہیں ، ہیں لوگ اکثر ڈھونڈتے
جانتے بے مہر گر تجھکو نہ دلبر ڈھونڈتے
مہ جبیں ہم آوزہی روئے زمیں پر ڈھونڈتے
ہمسر شاید رقیبوں نے سکھایا کچھ ، کہ آہ
وہ مجھے جب دیکھتے ہیں تب ہیں خنجر ڈھونڈتے
شب کو جب گُل ہو گیا یارو چراغ ماہتاب

پھر رہے مہوشں کو ہم باحالِ مضطر ڈھونڈتے
تو نے گردابِ محبت میں ڈبویا دل کو آہ!
ہم عبث پھرتے ہیں یاں اے دیدۂ تر ڈھونڈتے
وہ بُتانِ شوخ جو ہرگز نہ ملتے تھے کہیں
اب خدا جانے کہ مجھکو کیوں ہیں اکثر ڈھونڈتے
کچھ سکندر سے نہیں ہیں کم تیرے عاصی نصیب
آئینہ رویاں جو آتے ہیں ترا گھر ڈھونڈتے

شرارِ لختِ جگر سے مژہ تو ہاں جل جائے
تو چشم دیکھا کرے اور یہ سائباں جل جائے
جگر میں آگ لگے جسم بے گماں جل جائے
بڑا ہے ہو سمندر جو ناگہاں جل جائے
کہا یہ اُن سے کہ لاغر ہوں میں، تو یہ بولے
نکلتا بل ہے کوئی لاکھ ریسماں جل جائے
وہ سو گئے ہیں ذرا، شب ہے اک گھڑی باقی
الٰہی مرغِ سحر کا اب آشیاں جل جائے
نہ مسکرا لبِ دریا تو بیٹھ کر ظالم!
کہیں نہ برق سے پانی میں آسماں جل جائے
تمہارے دل کی خدا جانے پر قسم ہے مجھے
کہوں بُرا جو تمہیں تو مری زباں جل جائے
بدن کی دیکھ کے زردی ہنسے ہے ہر بُنِ مو
کروں جو آہ تو بس کشتِ زعفراں جل جائے
پڑی اذاں کی بھنک کان میں جو سوتے سے

تو بولے ۔ اُف بے موذن تری اذان جل جائے
خطر ہے داغ جدائی سے یار کی عاصی
جگر جلا تو بلا سے کہیں نہ جاں جل جائے

جو پہلے سے دم اسکا ترے طور سے نکل جائے
بسمل نہ تڑپ کر تہِ خنجر سے نکل جائے
کیونکر نہ تڑپ کر مرا دل بر سے نکل جائے
جب راہ میں وہ میری برابر سے نکل جائے
مت کھول ہوا میں تو اسے بام پہ چڑھ کر
خوشبو نہ تری زلف معنبر سے نکل جائے
اے دوستو انصاف کرو چھوڑ کے دل کو
کس طرح کوئی کوچۂ دلبر سے نکل جائے
کیوں دین میں لاتا ہے تو اپنے بُتِ بیدیں
کافر ہو کہ جو دین پیمبر سے نکل جائے
تو ہو نہ خفا بزم میں یہ اس لئے چُپ ہے
ڈرتا ہے کہ کچھ بات نہ مضطر سے نکل جائے
سو دی ہیں گرہ پر مجھے ڈر ہے یہی ہمدم
نامہ نہ کہیں بال کبوتر سے نکل جائے
کم ظرف کی یُوں بات سماتی نہیں دل میں
مے جیسے چھلک کر لبِ ساغر سے نکل جائے
ہاتھوں سے ترے ناک میں دم ہے شبِ ہجراں
کس سمت کوئی بیٹھ کے سر گھر سے نکل جائے
دریائے معانی کا تو عاصی ہے وہ تیراک

کیا آگے کوئی تجھ سے شناور ہے نکل جائے

گذار گورِ غریباں پر اسکا گر ہو جائے
تو خفتگانِ عدم کو وہیں سحر ہو جائے،
کمال رونے کا آنکھو تمہیں اگر ہو جائے
تو مالک اور بھی چشموں پہ پھر خضر ہو جائے
ابھی ہے دشت میں گر قیس فیض گریہ سے
عجب نہیں ہے کہ سلطانِ بحر و بر ہو جائے
کمند بام پر آج اس کے ہم نے ڈالی ہے
بڑا غضب ہو عسس کو اگر خبر ہو جائے
خدا کرے کہ ہمارے تو ناوک کی سینہ سے
ہمارا مرہم ریشِ دل و جگر ہو جائے
یہ دیکھکر ترے بیمار کو کہیں ہیں طبیب
الٰہی یا یہ اِدھر ہو وے یا اُدھر ہو جائے
غزلؔ اک اور وہ اس بحر میں لکھو عاصی
کہ جس کی خلق ثنا خواں اِدھر اُدھر ہو جائے

تھا ہجر مقدر میں لکھا کیا کہو کرتے،
گر صبر نہ کرتے تو دلا کیا کہو کرتے
جز شکر شکایت پہ بھلا کیا کہو کرتے،
لب بند نہ کرتے تو گلہ کیا کہو کرتے
تھی شرطِ وفا یاد جزا کیا کہو کرتے،
ہنگام دوا اُن سے دعا کیا کہو کرتے

ؔ دوسری غزل صفحہ ۱۹۳ پر ملاحظہ کریں۔

دردِ غم و فرقت کی دوا کیا کہو کرتے
درماندہ نہ رہتے حکما کیا کہو کرتے

ہم درس تو ہیں مدرسۂ عشق میں اُس کے
پڑھتے نہ اشارات صفا کیا کہو کرتے

طوطا بھی اگر پڑھنے سے ہو جاتا معلّم
علم و تعلّم علما کیا کہو کرتے

انساں میں اگر بُوئے محبت ہی نہ ہوتی
پھر ایسے کو بستی میں بسا کیا کہو کرتے

گر جیتے عاصی تو رقیبوں کی بن آتی
رکھتے نہ نگہ اُن سے لڑا کیا کہو کرتے

قتل کر کے جو مجھے قصدِ تماشا کرتے
یہ تڑپتا کہ تڑپنے پہ وہ لوٹا کرتے

ذائقہ موت کا عاشق جو بتایا کرتے
عیسیٰ و خضر بھی مرنے کی تمنا کرتے

پہنچے باغ میں اُس گل سے اُڑایا کرتے
خوب سا بلبلِ شیدا کو جلایا کرتے

اس کے قدموں سے نہ لگتے تو دلا کیا کرتے
سنگ پارس نہ تھے آہن کو جو سونا کرتے

رسمِ اُلفت یونہی پرچے میں پڑھایا کرتے
تم ہمیں چاہتے، اور ہم تمہیں چاہا کرتے

کیوں بتو اب تو خدائی کا ہو دعویٰ کرتے
زندہ مرتے ہیں، تو زندوں کو ہو مردہ کرتے

همنشیں ان سے جو مذکور ہمارا کرتے ،
تو وہ جھنجلاتے خفا ہوتے تبرّا کرتے

ناخن پنجۂ وحشت کو جو ایما کرتے ،
بخیہ ہائے دلِ صد چاک اُدھیڑا کرتے

میرے کہنے کو جو سرکار پذیرا کرتے ،
مُنہ نہ تھا غیروں کا کہ جا کر کہیں چرچا کرتے

دل کو مائل نہ خمِ زلفِ چلیپا کرتے ،
لٹ کی لٹ کہیں لٹتی ، کہیں لٹکا کرتے

هم دل و جاں سے ہیں اک بوسہ پہ سودا کرتے
لینا ہے لے لو ، نہیں کیوں ہو جھمیلا کرتے

قیس ملتا تو تلاشِ قدِ لیلا کرتے
حُسنِ یوسف کو خریدارِ زلیخا کرتے

مجھکو بلوا کے جو پاس اپنے بٹھایا کرتے
قہقہے رہتے ، بڑی عیش منایا کرتے

لاکے آئینۂ دل اس کو دکھایا کرتے
غرۂ حسن کو حیرت سے بڑھایا کرتے

ماہ کا نام کبھی منہ پہ نہ لایا کرتے
مہر کو داغِ جگر سوز کا پھاہا کرتے

هم تہِ تیغِ ستمگر نہ تڑپتے افسوس
ورنہ اک دم رُخِ قاتل کا نظارا کرتے

پار دریائے الَم سے تو اُتر جاتے ہم
یار کی تیغِ جہازی کا جو ڈونگا[1] کرتے

[1] چھوٹی کشتی

کم نہیں بھول بھلیاں سے یہ صحرا مجنوں
حضرت خضر بھی یاں آکے ہیں بھولا کرتے

لذّتِ بوسۂ شیریں سے جو واقف ہوتے
کوہکن پر لبِ حسرت ہی کو چپا ہا کرتے

کرتی لبریز صبوحی سے صبا ساغرِ گلُ
اور عاشق تیری اک بو ہر کو ترسا کرتے

ٹھنڈے ٹھنڈے کہیں چل بیٹھ دمِ سرد کیساتھ
دلِ تفتیدہ کبھی ہم ہیں اشارا کرتے

ایک دی ہے تپِ فرقت نے وہ دل سوزی سے
شعلہ ساں سینے میں اخگر جو ہیں بھڑکا کرتے

عام ہیں لطف تو بر شاخِ گلِ تر پہ صبا
انبیا ہوتا تھا مشکل ، جو نہ ہولا کرتے

چشمِ اُمید تھی جن سے ہمیں اے نکہتِ گلُ
اب وہی ہم سے ہیں صاف آنکھ چرایا کرتے

دیکھو ہنستے ہیں بڑے خواب کی تعبیروں پر
پہلے جو عالمِ رویا میں تھے رویا کرتے

حسنِ یوسف کا خریدار نہ ہوتا کوئی
نرخ بازار زلیخا کو جو سستا کرتے

کشتۂ چشمِ مفتن کی تیری مرقد پر
آکے جاروب کشی آہوئے صحرا کرتے

ہاتھ آجاتا اگر نقشِ سلیماں اپنے
حاضراتوں سے تو پریوں کو اُتارا کرتے

درد و غم ، رنج والم ، حسرت و حرماں وتعب

استنے رفقاؤں میں کس کس کا مداوا کرتے
ایک ہوتا تو دہن اس کا شکر سے بھرتے
دس کے منہ میں تو نہیں خاک بھی ڈالا کرتے
پہلے خوبانِ جہاں ایسے کہاں تھے عاصی
اب کے تو خط گل مضموں پہ ہیں مینا کرتے

الٰہی کیا جانیں ہم ہے کیا کیا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
جو کچھ ہے خالق تو ہی ہے سب کا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
ہر ایک تجھکو ہے یاد کرتا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
ہر ایک جپتا ہے نام تیرا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
کریم و پروردگار تو ہے کرم ہیں لیل و نہار تیرے
ہر ایک کو رزق ہے پہنچتا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
نہیں تعجب ہے کچھ بھی ہرگز جو مرد ماں اپنی چشم گریاں
کرے رواں ایک پل میں دریا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
کریں ہیں ضبط فغان و نالہ تمہارے مجبور اس لئے یاں
کہ شور حشر ایک ہو نہ برپا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
جو بھیجا ہاروت کو کوئیں میں تو بھیجا ماروت آسماں پر
کیا ہے دونوں کو قید دو جا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
فسانۂ عشق قیس و لیلیٰ فقط تھا رہ گئے زمیں پہ لیکن
ہمارا تیرا ہے قصہ پہنچا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے
غزل تماشہ کہی یہ عاصی غرضکہ تو نے عجب طرح سے
دکھایا انداز اب سخن کا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے

حیف ہے تا بفلک نالۂ بلبل پہنچے،
اور خبر کان تلک تیرے نہ اے گُل پہنچے

رُخِ رنگیں کو نہ نہار تیرے گُل پہنچے،
زلفِ پیچاں کو نہ ہرگز تیری سنبل پہنچے

ضعف سے گرچہ نہ تھی طاقتِ یک گام ہمیں
اُٹھتے اور بیٹھتے کوچہ میں تیرے تُل پہنچے

کر کے شب گھر کا بہانہ جو ہوئے ہم سے جُدا
بزم میں غیر کی تم دے کے ہمیں جُل پہنچے

ہمدمو بہرِ خدا جلد کہیں قاتل کو
خبرِ کشتۂ شمشیر تغافل پہنچے

یا الٰہی! طرفِ کلبۂ آشفتہ دلاں،
کاشکے بے کے صبا نکہت کاکل پہنچے

لکھ قوافی کو بدل کر غزلِ رنگیں اور
جس کو اے عاصیٔ شیدا نہ ذرا گُل پہنچے

گھر سے ہم ہو گئے بدلا اسکے نہ در تک پہنچے
ماہ رخسار کے اپنے جائے نہ گھر تک پہنچے

کاش کے پھر بھی مرا طالع تیکو یاوَر
لے مجھے بزم بتِ رشکِ قمر تک پہنچے

اے میاں اپنے بھی اقبال کے جاؤں صدقے
ہاتھ میرا کبھو تیری کمر تک پہنچے

جاں بری کیونکہ ہو اس کی کہ تیرا تیرِ نگاہ
توڑ سینہ کو بھلا جس کے جگر تک پہنچے

شب کے آنے کا کیا تم نے تھا وعدہ پر آہ
شام سے لے کے یہاں تم نہ سحر تک پہنچے
داغِ غم اس کے نہ کس رنگ جگر پر بیٹھے،
جبکہ بلبل نہ حضورِ گلِ تر تک پہنچے
دیکھئے باغ میں اس دہر کے عاصی اپنا
نخلِ اُمید کے کب ہاتھ ثمر تک پہنچے

جی بتنگ آئے تو مہجوروں نے ہستی چھوڑ دی
جاں تیرے دیدار کو جاناں ترستی چھوڑ دی
دامنِ صحرا خوش آیا ان کو اے لیلیٰ منش
مثلِ مجنوں تیرے دیوانہ نے بستی چھوڑ دی
کیا رہی خاک آبرو اے چشم جو تو نے بھلا
اشکباری دیکھ کر بدلی برستی چھوڑ دی
ایک ہی بوسہ پہ بس کرتے تھے سودا اُنکا ہم
کیا کیا یہ تم نے ایسی جنس سستی چھوڑ دی

قطعہ

ساقیا تکلیف مت کھینچ آ کے اُن کی بزم میں
مے کشوں نے یک قلم اب مے پرستی چھوڑ دی
یعنی چشم مست خوباں کے ہوئے مست مدام
تھی جو یاں باعث خرابی کا وہ مستی چھوڑ دی
خالقِ ارض و سما پر کر کے عاصی نے نظر
بس شکایت چرخ کی اے تنگدستی چھوڑ دی

ہجوم اشک سے ہے مردم مژہ کو داب تو دے
کہ بانسوں پانی چڑھا دیدۂ پُر آب تو دے
تڑپتا ہوں نہ خنجر چٹا شراب تو دے
کہ روز حشر یہ تشنہ تیرا جواب تو دے
نہ بوسہ دے مجھے میرا دل خراب تو دے
دل خراب بھی رہنے دے پر جواب تو دے
کہوں گا دل کی سب اپنی میں تجھ سے اے قاتل
چھری تلے کہیں دم لینے اضطراب تو دے
گھر اس کا دُور رہا پاؤں میں نہیں طاقت،
زمیں کی کھینچ تو چرخ بریں طناب تو دے
نہ نام جانو نہ گھر جانو، دل یونہی دے دوں
پتہ کچھ اپنا کوئی خانماں خراب تو دے
نسیم صبح کو یکمشت زر یہ اسے گلرو!
شگفتگی سے دکھ غنچۂ گلاب تو دے
رکھے ہے دانۂ خال آرزوئے سبز شدن
زمین حُسن میں عاصی تو اسکو داب تو دے

ہے شب وصل نہ پہلو سے سرک سونے دے
ساتھ اپنے تو مجھے صبح تلک سونے دے
شعلہ رُو کس سے یہ سیکھی ہے جگانے کی طرح
لے کے پانی مرے مُنہ پر نہ چھڑک سونے دے
ہمنشیں لاکھ طرح کھاؤں میں قسمیں لیکن
اسکو کیونکر مری اس بات کا شک سونے دے

ٹک تو لگنے دے کہیں آنکھ کہ جوں مرغِ اسیر
دل بیتاب نہ سینے میں پھڑک سونے دے
میں نے بوسہ جونہی مانگا تو وہ بولے جھنجلا
چل پرے ہٹ کہیں، بیہودہ نہ بک سونے دے
خار سا کھٹکے ہے آنکھوں میں تصور کس کا
شب کو کیونکر تیری مژگاں کی جھپک سونے دے
خفتگانِ عدم اک آن میں چونک اٹھیں گے
خاک پر اُن کے نہ دامن کو جھٹک سونے دے
شب تمامی کی وہ مو باف سے ڈر کر بولے،
برق اتنا مرے سر پر نہ چمک سونے دے
ہے خواہ تیرا اے بُتِ گلفام عاصی،
اسکو کہنا ہے تو یہ بات سرک سونے دے

چھوٹی مستی ہے کہاں کی نہ بہک سونے دے
چل بے چل تجھ سے کہا، یاں سے کھسک سونے دے
ہائے بکواس تیری آگ لگے باتوں کو،
نیند آتی ہے مجھے دیکھ نہ بک سونے دے
تیری خاطر سے پرے جاگتا ہوں او ظالم
دیکھ کب سے نہیں جھپکی ہے پلک سونے دے
دم رکا جائے ہے پسلی میں مری ٹھیس سی ہے
دیکھ چھاتی میں مرے دل کی دھڑک سونے دے
تیرے قربان ہوں اتنا تو کہا مان عاصی
چھیڑ مت مجھکو ذرا صبح تلک سونے دے

ہو گئی جان بھی ہلکان سرک سونے دے
بس بے بس، ہیں ترے قربان سرک سونے دے
غش سا آتا ہے مجھے جان بھی ڈوبی جاتی
نبضیں جاتی ہیں چھٹی جان سرک سونے دے
بس کہیں چھوڑ مری نیند سے حالت ہے بڑی
اتنا تو میرا کہا مان سرک سونے دے
پہروں تک مجھکو جھنجوڑے ہے نہیں سنتا تو
نکلی جاتی ہے مری جان سرک سونے دے
رات پھر آئے گی خلوت بھی ہے اور میں بھی ہوں
آج ہی نکلے گا ارمان سرک سونے دے
میرے پیچھے نہ تو سگ بن کے لپٹ، دور کہیں
کیوں بنا جاتا ہے حیوان سرک سونے دے
تری ان باتوں سے عاصی مرا دل جلتا ہے،
اس گھڑی چھوڑ مری جان سرک سونے دے

دل کی آبادی مرے یا خانہ ویرانی کرے،
ہے وہی اپنی خوشی جو کچھ تو اے جانی کرے
دل کو ہے کیونکر نیاز ابروے جانی کرے
جان کیوں وقف دم تیغ صفاہانی کرے
میرے خوش قد کو تو اے قمری اگر دیکھے کبھو
پھر نہ منہ ہرگز سوئے سرو گلستانی کرے
ساتھ میرے دوست نے جو کچھ کیا اے ہمدمو
وہ نہ اس دنیا میں ہرگز دشمن جانی کرے

ہے وہ رخسارِ مصفا سادہ رو کا دیکھ لو
آئینہ کو جو اسیرِ دامِ حیرانی کرے
کیا بھلا ہو دورِ مخلص پروری سے تو اگر
ایک دن میری قبول اے یار مہمانی کرے
کیوں نہ عاصی پھر لکھے اس بحر میں رنگیں غزل
جب غلامی وہ تیری اے یوسفِ ثانی کرے

خانہ آباداں بھلا کون ایسی نادانی کرے
دل تجھے دے اور اپنی خانہ ویرانی کرے
گلُ کو شرمندہ رخِ رنگیں تیرا جانی کرے
چشمِ نرگس کو تیری پابندِ حیرانی کرے
مردماں اس کی نگہ دزدی پہ جب باندھے کمر
پھر متاعِ دل کی کیا کوئی نگہبانی کرے
دیدہ گریاں پر ہماری کیوں نہ ہو رحمتِ خدا
ابرِ دریا بار کو خجلت سے بس پانی کرے
تاب کیا جو آپ کے دندان ولب سے رو کشی
گوہرِ شہوار اور لعلِ بدخشانی کرے
دربدر کب تک پھرے یہ عاصیِ اے شاہِ بتاں
آرزو ہے آستاں کی تیرے دربانی کرے

ہجر میں جس کے میں بیٹھا ہوں دلا من مارے
وہ لگے کاش گلے یا کہیں گردن مارے
عشق کا دم جو تیرے اے بُتِ پرفن مارے

تو وہ ظالم ہے کہ ہاں اسکو ہی گردن مارے
پھر بھلا یاں سے کوئی کیونکہ ہو جانبر مردم
کہ نیچے ہاتھ سے مژگاں کے تو چتون مارے
جی اُٹھے گر تو عجب کیا، کہ جو وہ عیسیٰ دم
خاک پر جس کی ذرا آکن کے دامن مارے
لاکھ انگریز کی پلٹن جو مقابل آویں،
ایک پل میں تیری مژگان کی پلٹن مارے
گوشۂ چشم پہ کاجل کا بنا خال ہے کیا
کوئی جوگی نپٹا بھسنت ہے آسن مارے
زلف میں دل ہے پھنسا بنلا ہے پونگی کا دم
ہاتھ ڈالے کوئی اس پر تو وہیں پھن مارے
نرگس آسا ہو وہ بیمار نہ کیوں اے عاصیؔ
آنکھ وہ جس کی طرف غیرتِ گلشن مارے

اے خانماں خراب خدا فضل گر کرے
تو عاصیِ نحیف ترے دل میں گھر کرے
اے رشکِ گل چمن میں اگر تو گذر کرے
گل تجھ پہ پھر نثار وہیں خوانِ زر کرے
جب اپنی تیغ کھینچ لے قاتل تب ہمدمو
میں اس کو مرد جانوں جو سینہ سپر کرے
تیرا رُخِ منیر مہ و چندال ہے شمس سا ہے
کس وجہ ترو کشی یہاں تجھ سے قمر کرے
قطعہ

احسان مند لطف و کرم کا میں اسکے ہُوں
جو کوئی میرے یار کو اپنی خبر کرے

یعنی غمِ فراق میں مرتا ہے اک جواں
ہونا رگی دوبارہ جو واں تو گذر کرے

طوفانِ نوح ہو وہیں برپا جہان میں
عاصی رواں جو چشم سے ٹک اشک تر کرے

ربط ہے مژگاں کو ازبس درد پنہاں سے مرے
خار صحرائے جنوں لپٹے ہے داماں سے مرے

مہر کو تابش ہے سوزِ داغِ ہجراں سے مرے
چرخ کو گردش ہے دورِ دُودِ پیچاں سے مرے

برق کو چشمک زنی ہے داغِ سوزاں سے مرے
آبروئے ابرِ تر ہے چشمِ گریاں سے مرے

پھر کے جیب آئے نہ ناصح کو کے جاناں سے مرے
بن گیا آنسو کیو تر چشمِ گریاں سے مرے

میں وہ عاشق ہوں کہ لے کر عشق مجھ سے چند سال
ہم سبق مجنوں رہا طفلِ دبستاں سے مرے

کس کی دزدیدہ نظر کا کشتۂ دل خستہ ہوں
چھوڑ جاتا ہی نہیں جو زخمِ پنہاں سے مرے

اُس لبِ پاں خوردہ کا بسمل ہوں اے جراحِ عشق
زخمِ دل سینا رگِ یاقوت و مرجاں سے مرے

اُس بُت نو خط کو بھیج ہے غزل اک اور بھی
کیوں نہ بھولیں اس وقت عاصی ہوش پرّاں سے مرے

چہرہ کیا پانی فلک تک جوشِ طوفاں سے مرے
بہ گئے ہمسائے سیلِ چشمِ گریاں سے مرے

ہر اک ذرّہ ہے تابِ داغِ سوزاں سے مرے
ماہ ہے مکڑی کا جالا طاقِ ایواں سے مرے

باعثِ آرامِ جاں ہے تیرِ جاناں سے مرے
ہو نمودِ صبحِ محشر شامِ ہجراں سے مرے

گُل کو کیا نسبت ہے اس رشکِ گلستاں سے مرے
داغ ہے لالہ کے دل پر سوزِ حرماں سے مرے

طوقِ سیمابی پڑا تھا گردنِ قمری میں عشق
تک پہنچے تھے دامنِ سروِ گلستاں سے مرے

ملکِ وحشت سے ملی ہو گی جسے استادِ غم
مشتبہ ہوں مہر بھی داغِ عصیاں سے مرے

کس طرح گلدستہ مضموں نہ باندھوں اے صبا
گل پڑے جھڑتے ہیں کلکِ گوہر افشاں سے مرے

بات سیدھی جو نہ سمجھے اور دے اُلٹا جواب
پیٹے جل جاتے ہیں صاحب ایسے انساں سے مرے

کیوں نہ ہوں ملکِ سخن میں اپنے یادِ انتقام
ہیں ذرا اشعار ملتے نظمِ سحباں سے مرے

دیکھئے مجنوں صفت لے جائے گی قسمت کدھر
پھر اُٹھائے پاؤں وحشت نے بیاباں سے مرے

سینۂ گُل خوردہ کو اپنی دکھا دوں گر بہار
جلوۂ طاؤسِ بستاں ہو گلستاں سے مرے

دیکھ کر خوشش قامتی اسکی اور اندازِ خرام

[illegible]

سرو لبستاں کٹ گیا سرو خراماں سے مرے
جنبش لب نے کسی کی ہے مجھے گھائل کیا
زخم دل بینا رگ لعلِ بدخشاں سے مرے
زخمیٔ تیغ تبسم کاش ہو عاصی ۔ تو پھر
زخم دھوتا آب گوہر لے کے جاناں سے مرے

محتاج اس کے در پہ رہا آدمی کرے
بخشے گا وہ ہی گرچہ خطا آدمی کرے
تھی آرزو یہی، کہ خدا آدمی کرے
پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے
حاصل نہ ہووے کچھ تو دلا کس اُمید پر
اس پُرجفا کے ساتھ وفا آدمی کرے
اس جینے سے مرے ہی بھلے ہم شبِ فراق
قابو جہاں نہ ہو وہاں کیا آدمی کرے
اے دل تو اپنے شیوۂ نیکی سے مت گذر
بد ہے وہ جو کسی کا بُرا آدمی کرے
ہوگا خطِ غبارِ دل آئینہ پہ زنگ
کیسے ہی کوئی اس کی جلا آدمی کرے
کس طرح ان بُتوں سے خدایا بچائیں جان،
پیدا جب ایسے ہوش ربا آدمی کرے
جب تک شفا وہ شافیٔ مطلق نہ دے نصیب
کیا آدمی کی خاک دوا آدمی کرے
اس دہر بے ثبات میں عاصی یہ چاہیئے،

غم کھائیے اور شکرِ خدا آدمی کرے

ناگاہ وقتِ ذبح یونہی ہم اچھل پڑے،
تیغِ نگاہِ یار میں لاکھوں ہی بل پڑے
سوئے عدم جو قافلہ سالار چل پڑے،
اشکوں میں لختِ دل مرے مل کر نکل پڑے
سرکش ہے زلف آج غضب تس پہ بل پڑے
شاید نمط کمان سے جو سو تیر چل پڑے
وعدہ ہے آجکل کے تیرے خاک کل پڑے
بیکل ہوئے جو کل سے تو آنسو نکل پڑے
تیغا کمر کا جو لب دریا اُگل پڑے
ہر موج میں تو بس وہیں تلوار چل پڑے
مضطر ہے ہر طرح سے یہ دل، ہے یہی خطر
ایسا نہ ہو، کہ چیر کے پہلو نکل پڑے
صدقے ہیں اُس جگر کے کہ دشمن کی لاش سے
خوں بہ چلا تو لیں وہیں ڈر کر اُچھل پڑے
بس اُٹھ کھڑا ہو صبح قیامت ہوئی یہ دیکھ
کھول آنکھ رہروانِ عدم کب کے چل پڑے
ڈر ہے یہ ہر دماں کہ نکل کر یہ طفلِ اشک
سودے پہ زلف کے نہ کہیں اب مچل پڑے
فوارہ کا سا حوصلہ اتنا نہ رکھئے تنگ،
چلو بھرے ہی پانی میں گنہ پھر اُچھل پڑے
سینہ پہ جوشِ داغ ہی رہتا تک آہِ سرد

شاید کہ روشنی میں ہوا کا خلل پڑے
عاصیؔ غزل وہ گرم لکھی اس زمین میں،
سنتے ہی جسکو بس وہیں حاسد تو جل پڑے

جگر اور سینہ و دل داغ حسرت سے گئے جل سے
مجھے شب شمرویوں کے جو کچھ یاد آ گئے جلسے
ہمیں اے ہمدمو معلوم ہوتا ہے یہ اٹکل سے
لچک جائیگی بیشک وہ کمر پھولوں کی ہیکل سے
پہنچ جلدی کہیں اے ماہ پارہ اب کہ بن تیرے
ہمیں کچھ آہ بیتابی زیادہ آج ہے کل سے
ہمارے گریہ کا دریا وہ طوفانی ہے لے ردم
کہ ہم چشمی ہے جسکو نربدا سے اور چنبل سے
پھرے ہے چشم میں اس لعبت چیں کا تصور اب
یہ دیکھو مردم اس میں ناچتی پتلی ہے کس کل سے
تہِ ابر آگیا خورشید تاباں یا کہیں مہوش
چھپایا تو نے رُخ دوپٹے کے ہی آنچل سے
لنڈھا جائے یہ عاصی ایک دم میں خم نے خم ساقی
اسے کیا خاک سیری شیشے سے ہو اور بوتل سے

تری شوخی نظر آئی جو کچھ چشم غزالاں سے
دیا گھبرا ہاتھ سے دل شہر میں پایا بیاباں سے
یہ حالت ضعف نے کی ہے ہماری درد پنہاں سے
کہ مثل نقش پا بیٹھے جہاں اُٹھے نہ پھر واں سے

نکل ہت لخت دل باہر سرائے چشم گریاں سے
کہ لوٹیں راہزن مژگاں ہیں آگئے قافلہ یاں سے

یہاں تک تنگ ہے دستِ جنوں سے لڑک سوزن بھی
اگر ٹانکے ہے دامن کو تو ادھڑے ہے گریباں سے

بسانِ شمع یونہی عمر کاٹی ہم نے حسرت میں،
نہ رہے آئے تھے کچھ واں سے نہ ہم کچھ لے چلے یاں سے

رنگے تھے جن کے خوں سے ہاتھ بولے آج سنتے ہیں
کہ نکلے پھوٹ کر برگِ حنا خوں شہیداں سے

لبِ چاہِ ذقن پہ خال کب ہیں دل کو لئے عاصی
برادر لے چلے ہیں حضرت یوسف کو کنعاں سے

مرے ہیں اس پہ جس نے دل کی بستی لوٹی آنکھوں سے
ہمیں کیا کام اے بادام تیری چھوٹی آنکھوں سے

شبِ فرقت ہیں ہے ہر استعارہ دستِ مژگاں پر
دمِ رخصت تھی کیا تسبیح گوہر چھوٹی آنکھوں سے

اگر تھی بزم غیروں کی پر آتے شب مقرر ہم
اشارہ بھی اگر کرتے ذرا تم چھوٹی آنکھوں سے

بہار گل اٹھاتی شاخِ گل سے ہے سدا بلبل
تجھے کیا دیکھنا نرگس ہے کدو چھوٹی آنکھوں سے

یہاں عاصی رکھو ہو تم تو الفت سبز رنگوں سے
ذرا ٹھہرو تو صاحب میں پلاؤں بوٹی آنکھوں سے

وہ تُرکِ چشمِ نازاں ہو نہ کیونکر بل پہ ابرو کے
کہ آب و تاب ہے تیغی سے دونی پھل پہ ابرو کے

دمِ عیسیٰ ہُوئے تیغِ دو دم مقتول پہ ابرو کے
قضا سو بار آ کر پھر گئی گھایل پہ ابرو کے

گہن سے یا دیا ہے یہ کنارہ ماہِ تاباں کا
جمے ہیں دو نکٹے یا قشقۂ صندل پہ ابرو کے

یہ خطِ پشتِ لب سے موج ان پائی نزاکت نے
نکالا حُسنِ مطلع ، مطلعِ اوّل پہ ابرو کے

ہر سو ہے مقامِ زلف و چشم و رخ ہے اک خطِ جادہ۔ جدھر چاہے دلِ گم گشتہ جا نکلے یہ ابرو کے

ترے کوچے میں کھاوے سنگِ طفلاں کیتلک جاناں
نہیں لازم ہے شدت اس قدر پاگل پہ ابرو کے

ترے رنجورِ غم کی اب یہ حالت ہے کہ بستر سے
اُٹھا جاتا نہیں ہرگز ترے گھایل پہ ابرو کے

اِدھر تو جنبشِ ابرو، اُدھر چشمک زنی عاصی
ہے اس پتلی کا پھرنا منحصر کیا کل پہ ابرو کے

نظر دھندلا گئی آنکھوں نے بھی بے اعتباری کی
غبارِ غم اٹھا تھا، دل نے بارے بردباری کی

اُڑائی زلف سے بُو ابر نے مشکِ تتاری کی
کہ آئے خضرِ دل کو یاد پھر ظلمت کی تاریکی

سویدائے دلِ شیدا سے ہے کچھ لطفِ تاریکی
کہ تاریکی میں باریکی ہے، باریکی میں تاریکی

ملی یہ ملکِ اُلفت سے طلب اسپ داری کی
کہ مہر داغِ عصیاں نے ہے چھٹی ماہواری کی

یہ خط آیا سُنا ہے اس نے راہِ وصل جاری کی
عدم تک حسن جا پہنچا، رسید آئی سواری کی
شبِ فرقت میں تجھ بن غم نے کیا نہ ستگذاری کی
کبھی سر در سے ٹکرایا، کبھی فریاد و زاری کی
چھٹیں جانِ حزیں سب شوخیاں برقِ شراری کی
جو شب بھر سیر دیکھی میرے دل کی بیقراری کی
لکھا وہ وہ مطلع تو شان ہیں نکٹی ہماری کی
کٹی بینی بسولا بن گئی بھوں شکل آری کی
سیہ بختی نے تیری کچھ تو عاصی بختیاری کی
خدا نے سہل کی جو بات تھی بے اختیاری کی

کیا تیزیاں ہیں ابلقِ لیل و نہار کی
ٹھہری نہ جس پہ ران کسی شہسوار کی
دیکھی تڑپ جو میرے دلِ بے قرار کی
لوٹا کی برق گود میں ابرِ بہار کی
پھوٹا جو یادِ کاوشِ مژگاں میں آبلہ
منت کشی نہ کرنی پڑی نوکِ خار کی
ساقی فلک پہ دیکھ خطِ کہکشاں نے کیا
کھینچی طناب خیمۂ ابرِ بہار کی
کیا اور مانگتے عوضِ بوسہ آپ ہیں
جاں تک تو ہم نے آپ کے اوپر نثار کی
جانے نسیم صبح اُڑا لے گئی کدھر
کوئے بُتاں سے خاک ہمارے غبار کی

تفسیدہ جاں وہ ہوں کہ مرے سوزِ سینہ سے
بھڑکے چمن میں آتش حسرت چنار کی
کہ دیتا ہے رقیب سے میرا جو رازِ دل
قاصد یہ خوئے بد ہے بُتِ بدشعار کی

قطعہ

کعبہ چلے تو شیخ جی ہو تم وطن کو چھوڑ
نہ پہر لگا کے ریش یہ ٹٹی شکار کی
آئے گی یاد دخترِ رز جب تمہیں تو پھر
بھاگو گے واں سے کر کے سواری حمار کی

قطعہ

شب کو تصورِ درِ دنداں میں سو گیا،
چھاتی پہ رکھ کے سلک دُرِ آبدار کی
اُڑتا ہے دل بھی طائرِ رنگِ حنا کی طرح
آتی ہے یاد جب کفِ پائے نگار کی
مجنوں مہارِ ناقۂ لیلیٰ کے واسطے
رسی بنا رہا ہے گریباں کے تار کی
چپاں دو ماہِ نو تہ دامن دکھا دیئے
شب ہم کو ساق شمع نے پائے نگار کی
عاصی اب اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
بوتل منگا لے اور مئے خوشگوار کی

پٹی صبا نہ کھول دل داغدار کی،
ایسا نہ ہو نگاہ پڑے چشمِ یار کی

خاطر ہے جوں چکور سہیں ایک یار کی،
بلبل کی طرح کیوں کریں منّت ہزار کی
تصویر لاغری پہ مِرے جسمِ زار کی،
مجنوں بھی رو دیا، کفنی تار تار کی
خط سے نمود اور ہوئی حُسنِ یار کی،
کھونٹی بھی اک خزاں سے نہ اُکھڑی بہار کی
بھڑکی ہے آگ جسم میں فرقت سے یار کی
سوز و گداز سینہ ہے بھٹی لہُار کی
عارض سلے لٹ پلٹ کی بڑھی زلفِ یار کی
سرحد پہ جالگی ہے حلب سے تتار کی
بے طاقتی میں تاب کیسے انتظار کی،
آنکھوں میں جان ہے تِرے اُمیدوار کی
قربان ہم نے دل کیا اور جاں نثار کی
تس پر بھی تم نے کچھ نہ سُنی جاں نثار کی
برسے نہ جائیے گا برستے میں ابر کے
گر دیکھنی ہے سیرِ چمن میں بہار کی
بیٹھے نہ گل کے چہرے پہ کس طرح گردِ عشق
بلبل ہُوئی ہے اِس مِری مشتِ غبار کی
سرسبز اپنے عاصی کو رکھا بذوقِ طبع
قدرت نمائیاں مِرے پروردگار کی

ننگ ہوں ہاتھوں سے قاصد اس دل بیتاب کے
بال پر باندھا ہے نامہ طائرِ بیماب کے

لے یعنی سنی ہے۔

نالۂ دل کیا کہے بلبل بغل میں داب کے
ہے خزاں ہر دم کھڑی سر پر گلِ شاداب کے
ہیں مژہ پُر اشک یوں اس دیدۂ پُرآب کے
فوج دُرّانی پڑی ہے گرد جوں تالاب کے
قصہ خواں گر نیند تھوڑی سی بھی آجائے، تو دوں
توڑے سونے کے، تجھے جوڑے بنا کمخواب کے
ہوں غریقِ بحرِ اُلفت میری جھپکے گی نہ آنکھ
دیدۂ ماہی نہیں ہوتا ہے قابل خواب کے

قطعہ

میں نہیں تڑپا جو وقتِ ذبح ہے موجب یہی
قاعدے مدِّ نظر تھے عشق کے آداب کے
ورنہ وہ قاتل کہ جو گلُ سے بھی ہو نازک بدن
اِس طرح رکھتا مجھے رانوں تلے کیا داب کے
دل نہ دینا ہیر کو رانجھا نہیں پچتائیگا،
بے وفا گلرو ہیں سارے تختۂ پنجاب کے
اس زمیں میں اور لکھ عاصی غزل رنگین ایک
بھیجنی غزلیں ہیں دو پاس اُس گلِ نایاب کے

برگِ پاں پھینکے چمن میں جب وہ گلِ رو چاب کے
پھر دکھادوں سرو میں دانے لگیں عنّابہ کے
داستانِ عشق اپنی وہ سُنے اے کوہکن!
زور دیکھے ہو ویں جس نے رستم وسہراب کے
کب افاقہ ہو تپِ غم سے مریضِ عشق کو

جو شرابِ وصل مانگے پیشتر نخداب[1] کے
آشنا نکلا مگر کوئی نہ بحرِ عشق سے،
جو پڑا چکر میں آکر اُلفت گرداب کے
کاوشِ لختِ جگر مژگاں پہ کب ہے چشمِ تر
شیر سیدھا تیرتا ہے دریاں میں آب کے
یاں تلک لے کر نہ آیا نامہ وصلِ صنم
ایسے کیا قاصد ترے پر لگ گئے سُرخاب کے
بل بے گرمی اُف رے آتش سینہ کی تفسیدگی
زخم پر رکھتے ہی پھاہے جل گئے تیزآب کے
جس جگہ جھک جائیں ساقی گوشۂ ابرو کماں
سجدہ گاہِ عشق ہے آگے اسی محراب کے
تیرے دیوانے نے صحرائے جنوں میں دابکے
توڑیں زنجیریں، بنا حلقے دیئے قلاب کے
کیوں نہ اس عاصی کو مہتابی پہ وہ مہوش پلائے
گرمئ گلگوں سے پُر ساغر گلِ مہتاب کے

ہمارا تجھ سے دلِ زار مبتلا اٹکے
اور آہِ دل سے رقیبوں کے دل ترا اٹکے
جو اس کی کاکُل پر پیچ سے تو جا اٹکے
تو کام سر لبر اے دل نہ کیوں ترا اٹکے
تمہارے دل کی خدا جانے پر یہ کیا مقدور
ہمارا دل جو کہیں آپ کے سوا اٹکے

---

[1] نخود آب - چنے کا پانی

کروں بیاں ترے بیمار کی حقیقت کیا
کہ سانس سینے میں ہیں اس کے دلربا اٹکے
ہزار تو مجھے اٹکاوے میں اٹکتا ہوں
عبث ہے آکے تو ہر بار ناصحا اٹکے
نہ کس طرح سے بھلا شوق سے میں جاؤں وہاں
جہاں کہ یہ دلِ شوریدہ سر میرا اٹکے
خدا کرے کہ ترا کام اے بُتِ خودکام
کبھی تو عاصی دیوانہ سے بھی آ اٹکے

لے کر صبا جو آمدِ گلُ کی خبر گئی
شادی سے پھول بُلبُل خستہ جگر گئی
یکسر حواس اُڑ گئے اربابِ بزم کے،
کیا اے پری تو ان کے جادو سا کر گئی
بھاوے نہیں ہے گل کو ذرا ہائے اے صبا
گو . . ں ا . ، کے عشق میں جی سے گذر گئی
زنہار یاں نہ وشت نوردی کی تھی ہوس
وحشت ولیک کھینچ ہمیں لے اُدھر گئی
تدبیر سے مسیح کی بھی تیرے بن ذرا،
بیتابی اپنے دل کی نہ اسے سیمبر گئی
برپا پھر ایک شورِ قیامت ہُوا وہاں
نالہ کی میرے شب جو صدا چرخ پر گئی
عاصی نکلنے پائے نہ ارمان دل کے سب
جلدی سے ہائے وصل کی شب ہو سحر گئی

چاہ ہی شوئے ذقن شب وقت پا کر لے گئی
پر کھوٹے سے دل کو کچھ قسمت بچا کر لے گئی
دین و دل چلمن سے کیا مکھڑا دکھا کر لے گئی
صبر و طاقت ہوش در پردہ اڑا کر لے گئی
یا رب اس کی تیغِ ابرو سے نہ کیوں مانگوں پناہ؟
ایک دم میں سر کئی تن سے جدا کر لے گئی
تیرے کوچہ کا کسے تھا شوق اے خانہ خراب
پر محبت دل کو دیوانہ بنا کر لے گئی
دیکھو یہ شامت کہ بہکا کر دل سرگشتہ کو
رہنمائی جانبِ زلف دوتا کر لے گئی
اب خدا جانے کہ بیچارے مسافر کو ہوس
ہائے بٹ ماروں میں اے یار دغا کر لے گئی
آہ! یہ کیسی تھی خواہی تھی اے بادِ صبا،
جو صنم کو خط نہ عاصی سے لکھا کر لے گئی

یاد رکھنا کہ کبھو تم بھی نہ کل پاؤ گے
رات دن عاصیٔ شیدا کو جو کلپاؤ گے،
سامنے جاؤ گے گر اس کی نگہ کے ہر دم
دل کو اپنے ہدفِ تیرِ اجل پاؤ گے،
دیکھ جاؤ اسے آج آن کے تم بہرِ خدا
ورنہ رنجور کو جیتا نہیں کل پاؤ گے،
قصد کیونکر نہ کیے کشورِ دل کا بمر سے،
جانتے ہو کہ یہاں جلد عمل پاؤ گے،

باز آؤ گے نہ رونے سے گر اے دیدۂ تر
تو یقین ہے، کہ بصارت میں خلل پاؤ گے
خواہش اس شوخ سے مت کبھو گلے لگنے کی
ورنہ اے حضرتِ دل مفت میں گل پاؤ گے
کھینچو مت تیغ جفا مجھ پہ کہ ہُوں میں عاصی
قتل تم کرکے مجھے کچھ بھی نہ پھل پاؤ گے

دیدۂ زار مرے گر کبھو گریاں ہوں گے
ایک ہی دن میں بپا سینکڑوں طوفاں ہونگے
جب بہم تجھ سے ہم اے رشک گلستاں ہونگے
گل شاداب یہ داغِ دلِ سوزاں ہونگے
مسکراتا مجھے دیکھیں گے گر اے رشکِ چمن
چاک غنچوں کے گلستاں میں گریباں ہونگے
ابرو دریا کی بھی شیخی وہیں جھڑ جائیگی
دیدۂ زار مرے جب گہر افشاں ہونگے
وہ گل اندام جو ہمخواب نہ ہوگا مجھ سے،
سیج کے پھول مرے خار مغیلاں ہونگے
دیکھیے ہائے کہ اس دور میں ہم صُورتِ جام
کب بہم لب سے مرے لبِ ترے جاناں ہونگے
اپنے استاد کے اب فیض سے ہم کو عاصی
یہ توقع ہے، کہ ہم صاحبِ دیواں ہونگے

بلاؤ اس کو ہمیں جس نے جی پیاری آن لگی

نہیں تو آہ ٹھکانے ہماری جان لگی
نگاہ اُن کی تو قاتِل وہ تیغ سان لگی،
رہے نہ جیسے کہ گردن پہ استخوان لگی
بچے گا دل نہ کبھی اس کی زلفِ سرکش سے
پھنسا ہی مارے گی وہ اسکی جان کان لگی
پڑا وہ تیغ بکف جب نظر، تب اِک خلقت
پناہ مانگنے اور کہنے ، الامان لگی
دو چار چشم کریں آئینہ سے کیونکر ہم
کہ صورت ان کی ہے خوش ہمکو مہربان لگی
گیا جو باغ سے وہ غیرتِ بہار تو پھر،
بہارِ باغ خزاں دل کو باغبان لگی
نہ چشم تر ہیں ہُوا صرف تیرے جانے سے رات
کہ رونے شمع بھی محلس کے درمیان لگی

جہاں میں گذریں کئی عید اسے پری افسوس!
کبھی گلے سے نہ عاصی کے پر تو آن لگی۔

لہر کی سرشک سی بوند کیا بہم آنے دیدۂ تر لگی
کہ رکھانے رنگ نئے مجھے یہ جدائی شام وسحر لگی
دل وجاں سے تیرا میں یار رہوں تیرا یار عاشق زار ہوں
تیرا دل وہ ہے کہاں لگا تیری آنکھ ہائے کدھر گئی
نہ شاد کرا دل زار سے مرے داغِ رنج وغم والم

نہ فراق میں تیرے ایک پل کبھو آنکھ رشکِ قمر لگی
کہو کس کے ساتھ نگہ لڑی کسے آپ دیکھیں ہیں پردہ میں
جو تمہاری آنکھ ہے اس گھڑی سرِ چشم روزن در لگی
اسے پہنچے بارش ابرِ تر کہو کس نمط سے اے ہمنشیں
وہ جھڑی ہے اپنی سرشک کی جو رہے ہے آٹھ پہر لگی
تو خدا کے واسطے عاصی اب نہ گلی میں ماہ وشوں کی پھر
کہ بہت خراب تو ہوویگا، کہیں آنکھ تیری اگر لگی

کب تو بیتابی کو پہنچے ہے ہماری بجلی
سامنے ہو کے نہ کر اپنی تو خواری بجلی
مَے کشی ابر میں کیا ہو، کہ گل اندام بغیر
تیغ کھینچے ہے دمِ بادہ گساری بجلی
پردۂ ابر میں چھپ جائے خجالت سے اگر
تاش کی اوڑھنی کو دیکھے تمہاری بجلی
اپنے دانتوں کی چمک آپ جو دکھلا دیں تو پھر
منہ نہ دکھلائے کبھی شرم کی ماری بجلی
کیا تماشہ ہے کہ صحرا میں پڑی ہنستی ہے،
ابر کی دیکھ کے اب گریہ وزاری بجلی
کس کو جوڑا یہ بنائی ہے تو اور کس کے لئے
دامنِ ابر میں ٹانکے ہے کناری بجلی
زرق برق آپ کے یہ حسن کا گر دیکھے تو پھر،
آپ پر جاوے وہیں شوق سے واری بجلی
اپنے استاد کے اب فیض سے دیکھو عاصی

کس قدر چمکے غزل میں ہے ہماری بجلی

کشتۂ نازِ مقامِ جبروتی بولے
بستۂ زلفِ زبانِ ملکوتی بولے

آپ تو بات زمانہ میں اچھوتی بولے
میں جو بولوں، تو یہ بولے مری جوتی بولے

عشقِ شمشاد ہُوا طوقِ گلوئے قمری
اے صبا بیچ میں اُن کے کوئی لاوتی بولے

اثرِ تربیتِ نیک اسے کہتے ہیں،
سامنے بلبلِ بُستاں کے جو دھوتی بولے

شورِ مرغانِ چمن بسکہ قفس میں ہے صبا،
ان دنوں خوب ہی صیاد کی طوطی بولے

لذتِ دوغ و شکر کو بزبانِ پارس
اہلِ ایراں سے جو بولے تو قرُوتی بولے

کھینچے نقشہ میں جو بہزاد شبیہِ قاتل
مُنہ سے تصویر ستم بہر ثبوتی بولے

نائرۂ وصل پہ عاصی کے وہ رقطائے[۱] نگار
شفقت و غیب سے لفظِ منقوتی بولے

کس لئے آئے تھے کیوں اے مہ جبیں جلدی چلے
ایسی کیا جلدی تھی جو بیٹھے نہیں جلدی چلے

شب جو بنیایا نہ اُٹھ کر وہ کہیں جلدی چلے
روشنی لے ساتھ اُن کے پھر نہیں جلدی چلے

۱؎ رقطا و منقوط دو صنعتوں کا نام ہے۔

وصل پر اُس گل کا یارب دل کہیں جلدی چلے
یا یہ جسمِ ناتواں میرا وہیں جلدی چلے

کھُلتے ہی پردہ وہ رشکِ نازنیں جلدی چلے
کچھ نہ بن آیا تو ہو کر شرمگیں جلدی چلے

زلف کو جنبش ہوا سے یوں خط و عارض پہ ہے
سبزۂ نورستہ پر جُوں ناگنی جلدی چلے

دورۂ افلاک کرتا ہے سوا دو دن میں طے
سب ستاروں سے نہ کیوں ماہِ جبیں جلدی چلے

دیکھتے ہی بسملِ گلریز کی اتنی بہار
جانِ سن بھرتے ہیں خوں میں آستیں جلدی چلے

نجد کا یہ تھا کہ پہنچی کان میں بانگِ جرس
پھر تو مجنوں بھی اُٹھا پائے حزیں جلدی چلے

کاوے کاوے سخت جانی ہائے عصیاں کچھ نہ پوچھ
دم اُلٹتے ہی حواسِ ہمنشیں جلدی چلے

کیا کسی اغیار نے آکر کہا کچھ کان میں،
اضطرابی پر ہوئے ٹھہرے نہیں جلدی چلے

مُنہ پہ اُڑ جائے ہوائی کی ہوائی رشک سے
گر سنونا باندھ آہِ آتشیں جلدی چلے

یوں طبیعت اپنی چلتی ہے زمینِ شعر پر
جوں صبا سے مل کے بُوئے یاسمیں جلدی چلے

نہ چھپا چہرہ کو تو زلفِ پریشاں کے تلے
ورنہ رکھ دوں گا گلا خنجرِ براں کے تلے

ہے سیہ زاغ تہِ چشمۂ حیواں کے تلے
خالِ مشکیں پہ نہیں اس لبِ خنداں کے تلے
مثلِ قمری قدِ گلرو کے تصور میں مدام
رو یا کرتا ہوں میں جا سروِ گلستاں کے تلے
ہنس کے دکھلاوے جو وہ شوخ چمک دانتوں کی
برق انگشت رکھے شرم سے دنداں کے تلے
اے پری چہرہ نہیں خط ترے رخساروں پر
دستِ قدرت نے رکھی ریل ہے قرآں کے تلے
مل گیا خاک میں آخر کو پریشاں ہو کر،
جو کھلا غنچۂ دل گنبدِ گرداں کے تلے
رو کے میں عشق میں گر اشک بہاؤں عاصی
چرخ آجائے ابھی موجۂ طوفاں کے تلے

دلا ہے یہ بلا اُس کاکُلِ پیچاں کی لٹ کالی
غضب ہو کاٹ کر جاوے جو یہ ناگن اُلٹ کالی
فقط دل کو نہ میرے پیچ میں دستار کے باندھا
کہ جانِ زار بھی شملے میں لے کر اس نے لٹکالی
نہیں ہے اے دلِ برگشتہ اس ظالم کا یہ جوڑا
خبردار اب کہ ہے بیٹھی ہوئی ناگن سمٹ کالی
خیالِ زلف کیونکر اس دلِ آشفتہ سے جاوے
چھٹائے سے چھٹے کب جب بلا جائے چمٹ کالی
وہ رشکِ مہر آیا گیند بازی کو مقابل جب
تو لے کر گیند اُس نے پس زمیں پر پہلے جھٹکالی

اِدھر اپنے رُخِ روشن پہ زلف اس نے پریشاں کی
اُدھر خورشید پر چھائی گھٹا بس آکے جھٹ کالی
سیہ چوڑی نہیں ہے ساعدِ بازو میں اے عاصی
یہ شاخِ صندلیں سے ہے گئی ناگن لپٹ کالی

مدّت سے غم کے گردشِ صبح و مسا ٹلی
پر اے قضا نہ سر سے میرے تو ذرا ٹلی
سو بار سر سے آفتِ ارض و سما ٹلی
آنکھوں سے پر نہ کاوشِ زلفِ دوتا ٹلی
آئے نہ کام تیشہ زنی اور وہ جوئے شیر
فرہاد سر کو چیر کے تیری قضا ٹلی
آیا خیالِ زلفِ بتاں جا کے قبر میں
بعد از فنا بھی سر سے نہ کالی بلا ٹلی
گردن کو کاٹ شام سے پائیں فراغتیں
بن تیرے رات ہجر کی اسے مہ لقا ٹلی
کل میکدے میں دخترِ رز ہم کو شیخ جی
سو مردوں میں کہ کے بھلا اور بُرا ٹلی
تکتا ہوں اُس کو طائرِ قبلہ نما کی طرح
کب میری آنکھ جانبِ در سے دلا ٹلی
سو بار اُس نے ٹالا۔ مگر کوئے یار سے
لے کر پیام وصل کا آہِ رسا ٹلی
نقشِ قدم کی طرح جہاں بیٹھے ضعف سے
ہم واں سے مر کے بھی نہ ٹلے اور وہ جا ٹلی

اب کا شکے آوے دلِ نادان ٹھکانے
یا عشق میں اس کے یہ لگے جان ٹھکانے
جب سان پہ تیغے کو لگادے وہ ستمگر
ہمدم رہیں کس طرح پھر اوسان ٹھکانے
دل میرا ہُوا ناوکِ مژگاں کا نشانہ،
صد شکر کہ بیٹھا تیرا پیکان ٹھکانے
پھرتا ہی رہا بار کے سودے میں شب و روز
بیٹھا نہ کبھو یہہ دل نادان ٹھکانے
ہجراں میں بُتِ آئینہ رو کے نہیں زنہار
عاصی کے حواس اے دلِ نادان ٹھکانے

کاکل ابرو خال بہم زنجیرو کلید و قفل بنے
حسن کے در پر یہ ہمدم زنجیر کلید و قفل بنے
زلفِ سیاہ و چین جبیں اور لب پر مہر خاموشی
دیکھتے ہیں اے یار وہم زنجیر کلید و قفل بنے
طارع اُس آہن کی ہمایوں جسکے قسم اللہ کی اب
واسطے تیرے در کے صنم زنجیر کلید و قفل بنے
کان میں اس کے بُندا بالا ہے در گوش یہ حلقہ زلف
مل کے یہ تینوں باہم زنجیر کلید و قفل بنے
نام نہ سمجھے سپاہ گری کا یعنی دلا اس دور میں آہ
ٹوٹ کٹار اور تیغ دو دم زنجیر کلید و قفل بنے
دیکھ کے یہ زنجیر و کلید و قفل کہے ہے یوں ہر ایک
ہم نے تو ایسے دیکھے کم زنجیر کلید و قفل بنے

عطرِ اُلفت لگا دیا کس نے
بوئے گُل میں بسا دیا کس نے

تجھ کو آئینہ لا دیا کس نے
دلِ عاشق دلا دیا کس نے

محوِ نظارہ کرکے خلقت کو
گھر کا رستہ بھلا دیا کس نے

چاک دامانِ گل کو اے بلبل
رگِ جاں سے سلا دیا کس نے

گرمیٔ حُسن سے اُٹھا کے نقاب
رُخِ تاباں دکھا دیا کس نے

میں تو حیراں ہوں عشق میں بخدا
بُت کا بندہ بنا دیا کس نے

مرغِ دل کو دکھا کے دانۂ خال
دامِ غم میں پھنسا دیا کس نے

کُوئے قاتل میں تڑپا جب عاصی
خوں بہا کا بہا دیا کس نے

جو خوش قامت کھڑا ہوتا مِرا اُٹھ کر زمیں پر ہے
تو پھر وہیں قیامت ہوتی اک برپا زمیں پر ہے

ہُوا ہے جلوہ گر کوٹھے پہ اب وہ بے حجابانہ
سنبھل او مہر ورنہ تو ابھی گرتا زمیں پر ہے

رواں ہر گام پر ہے چشمۂ آب اپنے گریہ سے
کہیں بھی پاؤں رکھنے کی نہیں اب جا زمیں پر ہے

کوئی مارے خطر کے واں قدم رکھتا نہیں ہر سو
پڑا جب دیکھا اس زلف کا سایہ زمیں پر ہے

مِرے رشکِ چمن کے دیکھیں ایوانِ نگاریں کو
کسی نے باغِ جنت گر نہیں دیکھا زمیں پر ہے

فلک کے ساتھ دعویٰ ہمسری کا جس کو ہے پیارے
سر اُن کا آگے تیرے مثلِ نقشِ پا زمیں پر ہے

جہاں دیکھو مِرے قاتل کے کشتوں کے ہیں اُن پشتے

نہیں جائے خرام اے عاصیؔ شیدا زمیں پر ہے

کون کہتا ہے کہ وا زلفِ دوتا کر بیٹھے
طائرِ دل کے لئے دام بچھا کر بیٹھے
آخر کار مجھے خوب رُلا کر بیٹھے
بیٹھے تھے آ کے تو طوفان بپا کر بیٹھے
پردۂ ابر میں چھپ جائے نہ کیونکر خورشید
جب نقاب اپنے تو مکھڑے سے اُٹھا کر بیٹھے
تیری شوکت سے نہ کم ہو مرا افزوں ہو وقار
پاس میرے شہِ خوباں تو جو آ کر بیٹھے
کس کے گھروٹ کو ہے آپ لوجانا منظور
آپ جو زلفِ پریشاں کو بنا کر بیٹھے
میں ہوں یا تم ہو نہیں اور کوئی خلوت میں
پھر بھلا کس لئے مکھڑے کو چھپا کر بیٹھے
کیوں نہ پھر عرش پہ تیرا ہو دماغ اے عاصیؔ
ساتھ تیرے جو صنم کوٹھے پہ جا کر بیٹھے

دل نہ کیونکر اَلم و یاس سے باہم ہووے
اپنے پہلو سے جُدا جبکہ وہ ہمدم ہووے
ہجر میں تیرے مری چشم اگر نم ہووے
یہ جھڑی یا نہ جٹے کہ برسات کا موسم ہووے
وہ خوش ابرو جو ہم آغوش نہ ہمدم ہووے
عید کا چاند نہ کیوں ماہِ محرم ہووے

۲۰۳

چشم گریاں مری لے جائیو تو اے دہقاں
بارش ابر تیری کشت پہ گر کم ہووے
دل سے پیرے تیری پیکاں نے کیا ربط ہے یوں
کہ نگینہ سے بہم جس طرح خاتم ہووے
عالمِ آب ہے واں اور شبِ مہتاب و لے
پاس تو ہووے تو پھر اور ہی عالم ہووے
جائے مسجد میں اگر وہ بُتِ کافر تو دلا
اس کی تعظیم کو محراب وہیں خم ہووے
اب بتبدیل قوافی وہ غزل لکھ عاصی
کہ ثنا خواں جسے یاں سن کے اک عالم ہووے

کھینچ تیغا جو مرے گرد وہ ناحق ہووے
ہمدم کیونکہ نہ پھر رنگ مرا فق ہووے
نہ وہ ناداں نہ سیانا ہے کریں کیا ہمدم
خاک سمجھا دیں سمجھ جس کو نہ مطلق ہووے
ماہرو غیر کی آغوش میں جب ہو ہر شب
پھر نہ کیوں مثلِ کتاں سینہ مرا شق ہووے
چنگ و نے شیشہ و مے سب ہے مہیا لیکن
بزم میں آئیں اگر آپ تو رونق ہووے
صاف بے دید ہے تو صورت آئینہ غرض،
تجھ سے جو آنکھ لڑاوے سو وہ احمق ہووے
چاہے جو کچھ وہ میسر ہوا سے دنیا میں
جس پہ ٹک مرحمتِ ایزدِ برحق ہووے

بُت تو خط کو اگر نامہ لکھے تو عاصیؔ
لکھیو بھی نہ کوئی بات جو متعلق ہووے

دِل میرے گُلِ اندام کا مجھ پر اگر آوے
پھر نخلِ محبت میں کھِلے گُلِ ثمر آوے
باز آئے ہم اس نامہ و پیغام سے یارب
جیتا کہیں پھر کر مرا قاصد اِدھر آوے
وہ آئے جو بالیں پہ تو اُٹھکر پئے تعظیم،
کس طرح نہ سینہ سے دل آوے جگر آوے
گیا ہے وہ گلفام پئے سیر چمن میں
اب بادِ صبا بھی یہاں نہ ڈھانک کر آوے
دن رات ہے اس گُل کے تبسم کا تصوّر،
کیا سبز ہو شیشہ میں جو بجلی اُتر آوے
سوتے ہوئے دلبر کو مرے پر سے جگایا
موت اب کہیں جلدی تجھے مرغِ سحر آوے
تقدیر کے سودے کو کرے کیا کوئی عاصیؔ
قاصد نہ پھرے واں سے نہ جس کی خبر آوے

شعلہ ساں ہم تو ترے ہجر میں جل کر بیٹھے
ہے غضب سوختگاں سے تو جو مل کر بیٹھے
نام سن کر وہ مرا کاشش نکل کر بیٹھے
خوب ہو سیر جو یہ اسم عمل کر بیٹھے
جام و مینا و دف و چنگ مہیا ہے وئے

رونقِ بزم ہو تب جبکہ تو چل کر بیٹھے
بوسۂ رُخ کا کرے ہے عوضِ دل سودا،
پر خطر ہے کہ طبع کچھ نہ خلل کر بیٹھے
یار دیکھے نگہِ لطف و کرم سے یارب
یا کہیں دل کو ہدف تیرِ اجل کر بیٹھے
چاہ بھی پاس ذقن کے ہے یہ کہدو دل سے
کہ وہاں جا کے جو بیٹھے تو سنبھل کر بیٹھے
ہوں میں عاصی یہ اسے بھی میں کرم سمجھوں ہوں
سامنے میرے سے جو تم آنکھ بدل کر بیٹھے

عشق نے جس کے کیا افسوس یوں رسوا مجھے
یاد بھی کرتا نہیں وہ شوخ بے پروا مجھے
یاں کسی صورت سے تو آ، یا وہاں بلوا مجھے
صورت اپنی اسے بُتِ آئینہ رو دکھلا مجھے
اک قیامت سر پہ ہوتی ہے بپا یا للہ تب
یاد آتا ہے صنم کا جب قدِ بالا مجھے
کوچہ و بازار میں پھرتا ہوں سرگرداں جو آہ
کس بُتِ کافر کی کاکل کا ہُوا سودا مجھے
مردماں خواب اُڑ گیا آنکھوں سے اپنی یک قلم
جب سے آئی ہے نظر وہ نرگسِ شہلا مجھے
شکل آئینہ اسیرِ دامِ حیرت ہوں جو میں،
کس کی صورت کا دلا اب بھا گیا نقشہ مجھے
آخرش عاصی تمہارا تھا بھلا کس واسطے

خاک میں تم نے ملایا شکلِ نقشِ پا مجھے

رخسار مصفا خال غضب، پلکوں کی جھپک پھر ویسی ہی
آنکھیں وہ بلا چتون وہ ستم ابرو کی لچک پھر ویسی ہی
کرتی ہے گلے میں حبالی کی اور تس پہ دھنک پھر ویسی ہی
سرمہ پہ ستارہ ٹانک غضب جگنو کی چمک پھر ویسی ہی
ہنستا وہ غضب اس کافر کا جو بجلی کسے ہی ہوش اڑیں
ہے طرزِ قیامت کیا ہی عجب وہ شوخی تماشا سر تا پا - ہے سارا خرام پھر ویسا ہے زیور کی دھمک پھر ویسی ہے۔
لب لعل کی رنگت ایسی ہے دانتوں کی چمک پھر ویسی ہی
کیا چشم میں سرمہ ہے وہ عجب ہیں طرفہ مسی مالیدہ وہ لب
اور کان کا بالا قہرِ بلا بندے کی پھڑک پھر ویسی ہی
وہ حسن جہاں سوز ایک بلا، اور تس پہ غضب ہے آن و ادا
گہنا وہ تماشہ پھولوں کا خوشبو کی مہک پھر ویسی ہی
دن رات کی صحبت آتی ہے جب یاد تو کہتا ہے عاصی
اک روز ہو یا رب ویسا ہی اک شب ہو فلک پھر ویسی ہی

تو مسند طرب اغیار سے واں شہ نشیں میں ہے
یہ بیدل ساتھ حرماں کے یہاں غلطاں زمیں میں ہے
حلاوت جو لبِ نوشینِ شوخِ نازنیں میں ہے
نہ وہ ہرگز شکر قند و نبات و انگبیں میں ہے
پریشاں دل ہے وہ آفت کا مارا قبر میں بھی آہ
سوا تیری جو یاد کاکلِ پُر پیچ و چیں میں ہے
خدا کے واسطے جلدی کہیں آ اے بُتِ کافر
نہیں جاں اب ترے بن جسمِ عشاق حزیں میں ہے

رُخِ رخشندہ تیرا رشکِ خورشید ہے اور ہاں
تفاوت ماہِ تاباں میں نہ کچھ تیری جبیں میں ہے

نہ کیونکر نالۂ شبگیر کھینچیں ہم بھلا یارو
دلِ آشفتہ اپنا قید زلفِ عنبریں میں ہے

تمہارا ذکر ہے وردِ زباں ہر ساعت و ہر دم
تمہاری یاد عاصی کے دلِ اندوہگیں میں ہے

یہ طریق اچھا نہیں کچھ اے بُتِ خودکام ہے
ہم دُعا کرتے ہیں تو دیتا ہمیں دشنام ہے

بن ترے ربط ایک تو گریہ سے صبح و شام ہے
دوسرے آہ و فغاں سے ہمکو رہتا کام ہے

کیا کہیں ہم کیا کریں اے وائے یاں تو بے زری
اور دلا خواہانِ زر وہ شوخ سیم اندام ہے

اشک ڈھلتا ہے سوئے کاکل تو یہ کہتا ہے دل
راہزن ہیں وہ وہاں اور دیکھ سر پر شام ہے

ہائے گر صیاد دیکھے گا تو کروائے گا ذبح
ایسی بے بال و پری میں ہم سے ٹوٹا دام ہے

دیکھ تیرے چشم کے بیمار کو بولے طبیب
حق میں اس کے زہر یارو روغن بادام ہے

وہ غزل اب لکھئے عاصی جو ہُوئی ہے یاں طرح
شاعروں میں چاہئے گر تم کو اپنا نام ہے

واں وہ غیروں میں صریحاً لے ہمارا نام ہے

ہم کہیں کچھ، تو کہے ہے کیا تمہارا نام ہے
منفصل کوئے بتاں سے پوچھنا بادِ صبا،
وہ کہاں رہتے ہیں جن کا ماہ پارا نام ہے
مردماں کہتے یہ سچ ہیں، وہ ہے تیری چشمِ مست
نرگسِ مخمور جس کا گلعذارا نام ہے
عاشق اس دلبر کے ہم ہیں اور کچھ واقف نہیں
مہر وسہ کہتے کسے ہیں کس کا تارا نام ہے
تو نہیں کرتا ہے یاد اسکو کبھی پیارے ولے
رات دن جپتا یہ عاصی تیرا پیارا نام ہے

حور و پری سے کام نہیں گر حسین ہے،
صورت وہ اور ہے جو مرے دلنشیں ہے
بیٹھا وہ گلعذار سر شہ نشین ہے،
غلطاں یہ بے قرار بروئے زمین ہے
ہاتھوں سے اپنے تونے کیا کس کو ذبح آج
ظالم جو تیری خون بھری آستین ہے
رخسار کے ہے گرد خطِ عنبریں ترے
یا آنکہ ماہ اب کہیں ہالہ نشین ہے
کیا تاب اس کے رُخ سے کرے مہ جو روکشی
رخشندہ اسکی مہ سے دو چنداں جبیں ہے
ہر صبح و شام مہر و محبت ہے غیر سے
اور آہ میرے ساتھ تجھے بغض و کین ہے
رکھتا ہے کیا ارادہ خدا جانے عاصی آج

بیٹھا جو آ کے سامنے وہ ترکِ چین ہے

لگتی دوا کسی کی نہیں ہے دُعا مجھے
حیراں یہی ہوں میں کہ ہوئی کیا بلا مجھے
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں، تو پھر
بتلاؤ تم ہی دوستو اب کیا ہُوا مجھے
دن رات ہے جو دھیان اسیرِ زلفِ یار کا
آیا ہیں کس بلا میں ہوئی کیا بلا مجھے
لوحِ مزار کس لئے ڈھونڈو ہو دوستو!
کافی ہے اس کا ایک، فقط نقشِ پا مجھے
عاصی تمہارا طالبِ دیدار ہے فقط
درکار اَور کچھ نہیں اس کے سوا مجھے

اُس شوخ کی شوخی کے برابر کوئی کب ہے
آفت ہے بلا ہے گلِ فتنہ ہے غضب ہے
کیا کیجئے رقم وصفِ صفائے لبِ جاناں
گلبرگ ہے فالودہ ہے یاقوت یشب ہے
اُس جعدِ مسلسل کے کچھ اَوصاف نہ پوچھو
گرداب ہے زنجیر ہے قلّاب ہے شب ہے
ہے سوزِ جگر رشکِ صد آئینۂ روشن
یارب دل تفسیدہ ہے یا شہر حلب ہے
پردے میں جو مستوں سے لڑا بیٹھی ہے آنکھیں
دختر ہے تری شیخ کہ یہ بنتِ عنب ہے

جس نے اُسے دیکھا یہ کہا ہائے اے ظالم
صد رشکِ قمر ہے کوئی یا قدرتِ رب ہے
جوں برق تڑپتا ہے جو سینے میں شب و روز
پارہ ہے کہ عکسِ دلِ پُر رنج و تعب ہے
اس درد و الم پر یہ صعوبات جُدائی
عیسیٰ کو تعجب مرے جینے کا ہی اب ہے
کس طرح سے عاصی ہو لباسِ تنِ عریاں،
جو نورِ بشر ہے مجھے اسکی ہی طلب ہے

ہے زرہ پوش اور چھپا اسکا بدن آہن میں ہے
غرق سر تا پا وہ ترکِ صف شکن آہن میں ہے
دیکھ کیوں کھینچتا ہے ظالم دیدۂ ہو تن سے دُور
مجھکو رہنا آخر اے تارِ کفن آہن میں ہے
آرسی میں چہرۂ گلگوں کی دیکھ اپنی بہار
محوِ حیرت تجھے کہ کیا سیرِ چمن آہن میں ہے
قبر تک اُترے نہ وحشی کے تیرے زنجیر و طوق
بعد مردن بھی رہا پائے محن آہن میں ہے
ہو شکست دل پہ میرے کیوں کہ اُس ظالم کو رحم
لاکھ تدبیریں ہوں کب پڑتی شکن آہن میں ہے
صاف دل کا ہو سبب باطن سے کیونکر اختلاط
کب ملا تا کیمیا کو اہلِ فن آہن میں ہے
دیکھ مسّی کی دھڑی اُسکے لبِ یاقوت رنگ پر
جلوہ گر اچھا ہُوا لعلِ یمن آہن میں ہے

اس زمینِ سخت فولادی میں اے عاصی یہاں
اس طرح ثابت بٹھا دینا سخن آہن میں ہے

بسترِ خارِ مغیلاں پر یہ اپنا حال ہے
تن مرا ہو کر مشبک صورتِ غربال ہے۔
زلف سے ہمسر ہے بالا خط سے باہم خال ہے
وہ کمند و حلقہ ہے یہ دانہ ہے وہ جال ہے۔
نے کوئی اختر شناس اور نے کوئی رمّال ہے
سچ تو یہ ہے اپنی ہی اک گردشِ اعمال ہے
دل تو پہلے ہی گرفتارِ سوادِ خال ہے
اور جال شانہ کے ہاتھوں زلف میں پامال ہے
میرے نالوں سے نہیں خواب عدم میں انکو چین
قبر میں بھی اپنے ہمسایوں کا یہ احوال ہے
کشتۂ کاکل ترا کیونکر نہ سووے چین سے
سایہ افگن اس کی مرقد پر درختِ سال ہے
دستِ صیاد و اجل کو مرغِ دل روتا ہے کیا
دام میں زورِ اسیری ہی شکستِ بال ہے
ٹھہرنا مشکل ہے دم کا جوں حباب اک دم کے دم
بہ مثل پر سچ ہے گھڑی میں جان من گھڑیال ہے
کشتۂ خط کے ترے مرقد پہ اے صیادِ خلق
موجِ رنگِ سبزہ سے دیکھا تو پیدا جال ہے
ورنہ اک دم میں قیامت مردماں ہو وے بپا
آستیں ہے گاہ چشمِ تر پہ گہ رومال ہے

ہے دلِ بیتاب رقصاں جو حریم سینہ میں،
آہ یہ کس کی صدائے حلقۂ خلخال ہے
نشّۂ مَے سے زباں پر آبلے نکلے ہیں کیا،
اے مغاں اِس میں مغیلاں کی بھی پڑتی چھال ہے
خاک میں لوٹے ہے گنجشک سرِشک اس واسطے
خوش ہو اے دہقاں پسر بارش بہت اس سال ہے
کیوں نہ ہوں[1] ہمرنگ کے دونے کہ ظالم تونے آج
سبزہ رنگی پر قیامت سبز اوڑھی شال ہے
ہمدمو قاتل سے میرے جاکے پوچھو تو سہی،
قصّہ تھا سو مٹ گیا اب کیسی قیل وقال ہے
گو دلا مفلس ہے تو کر دیکھ پھر اس سے سوال
مفت بھی دیدیوے بوسہ شاید اس کا مال ہے
یاں دمِ قلیاں کشی اُس آتشیں رو کے بغیر
دود ہے آہِ جگر اور لختِ دل مہنال ہے
کیوں نہ موج بحرِ حسرت جُوں رگِ خارا ہو خشک
زلف کے سودے سے یہ عاصی تو فارغبال ہے

جگر تڑپے اِدھر ہے دل اُدھر برمیں سے نکلے ہے
تماشا ہے، کہ اک مرتا ہے اک گھر میں سے[2] نکلے ہے
تڑپ کر دل ہمارا برق ساں بر میں سے نکلے ہے
وہ دلبر مسکرا کر جیب برابر میں سے نکلے ہے
مبارک ہو تجھے لیلا کہ تو نے فصد یاں لی ہے
وہاں مجنوں کے لوہو ہر رگِ تر میں سے نکلے ہے

[1] گنجفہ کی اصطلاح ہے۔ ہمرنگ نقش میں رقم دُگنی ہو جاتی ہے۔ [2] ہو۔

دلِ کم ظرف میں مضمون رنگیں کب سماتا ہے
یہ سچ ہے مے بھی چھلکے ہے تو ساغر ہی سے نکلے ہے

وہی ہے استعارہ میرے دل کا تم سمجھ لینا،
سوا نامے کے جو بالِ کبوتر ہی سے نکلے ہے

اُڑا کر آہ سوزاں یوں تن لاغر سے ہائے کہتے تھے
بگولے کے کہیں تنکا بھی چکر ہی سے نکلے ہے

کیا ہے ربط دل سے یہ ترے پیکاں نے اے قاتل
تو کھینچے ہے وہ الٹا تیر کے سر ہی سے نکلے ہے

زبانِ تیشہ کہتی تھی شہر رپہ کوہکن کب ہیں،
شعاعِ نکمۂ شیریں ہی پتھر ہی سے نکلے ہے

رکھے ہے آج جو مضمون نادر یہ ترا عاصی
سو کاہے کو کسی شاعر کے دفتر ہی سے نکلے ہے

رکھا کیا بزم میں جامِ شراب آنکھوں کے نیچے ہے
کہ ساقی آج دورِ آفتاب آنکھوں کے نیچے ہے

فقیروں کو نہیں ہوتی ہے خواہش سیرِ دریا کی
کہ نقشِ بوریا ہی موجِ آب آنکھوں کے نیچے ہے

اُبھر مت بحرِ ہستی میں تو اتنا با تنک ظرفی،
تیری تو سربلندی اے حباب آنکھوں کے نیچے ہے

نگہ کیوں ڈالتا ہے خیمۂ گردوں پہ او غافل
ذرا تو دیکھ تیری جائے خواب آنکھوں کے نیچے ہے

نہ کیوں مضمون نادر اس زمیں میں اپنے ہوں عاصی
رہے ہے طرزِ ظہیر فاریاب آنکھوں کے نیچے ہے

مدعی ہم سے سخن ساز بہ سالوسی ہے
پھر تمنا کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے
زلف چھٹتے ہی ڈسے چشم وہ حیا دوسی ہے
گونج پالے کی بلا ڈھانے کو بچھّوسی ہے
نازنیں نورِ نزاکت میں تو خوش خوسی ہے
اس کی پری نگہ متل کو مابروسی ہے
ہاتھ بندھوائے گی چوروں کی طرح سے شب کو
ایسی کیا تجھ کو حنا خواہش پابوسی ہے
چاندنی میں ہے کوئی عطر لگا کر بیٹھا
کہ بسی چادرِ مہتاب میں خوشبوسی ہے
لذّتِ ساعدِ سفاک نہ بھولے گی کبھی
جس لبِ زخم نے شمشیر تری چوسی ہے
داغِ سینہ سے اٹھا مرہم زنگار یہ عشق
چمن یاس میں یہ جلوۂ طاؤسی ہے
فہمِ عنقا کے تصوّر میں نہ آئی جو کمر
سو دکھاتی نظر عشق مجھے مُوسی ہے
دمِ نظارہ بینی سے یہ لولا بنیا،
پھر ٹکا رام کی سَوں مجھ سے تو کیوں وسی ہے
کہتے سنبل کو ہو گیا سنبلۂ چرخ کا رنگ
ایکے سال از رہِ تقویم ہوا طوسی ہے
ہے یہ تحویلِ شرف کہتے ہیں جس کو نوروز
نہ تو یہ رسم کیانی ہے، نہ کاؤسی ہے

لہ میوات میں بنیوں کا تکیہ کلام

زلف و رُخ آج کے دن کیوں نہ برابر ہو ویں
ملکِ شام کے ہمراہ سپہ روسی ہے
گوہر نظم ترے آتے ہیں جو بحرِ دل سے
موج تر سے مگر اک قوت بازوسی ہے
شہرہ آفاق سخن دیر و حرم میں اپنا
مثلِ بانگ جرس و نالۂ ناقوسی ہے
کون گُل خوردہ ہُوا گنبدِ اخضر کے تلے
بلبل و گُل کو جو آب جلوۂ طاؤسی ہے
لذّتِ چاشنئ ریشِ جگر وہ جانے
آم کے رس کو پیا گٹھلی اگر چوسی ہے
خُلق کی تیرے ہر اک حلق میں کچھ بُو سی ہے
تجھکو خلّاق نے اخلاق کی دی خوسی ہے
مردمِ چشم عدو کو تیرے کالے پانی
ایسی نگری میں بسائیں کہ جو ٹاپوسی ہے
آج میلہ کا ہے دن قبلۂ عالم مجھکو
وہ عنایت ہو کہ جو صبا ئے ملبوسی ہے
نغمہ سنجی میں ہے وہ بلبلِ بستاں عاصی
لحنِ قمری کے حضور اس کی نوا کو سی ہے

ہم سے اور بیکش سے ابدل گفتگو کی جائے ہے
تیسرے کا دخل کیا یاں وو بدخو کی جائے ہے
ہُوں شہید تازہ داغ دل سبو کی جائے ہے
گو رو وہ اک کاسۂ چینی میں مو کی جائے ہے

بُرّش ابروئے قاتل پر ہنسے مت زخمِ دل
خامشی لازم ہے اس جا آبرو کی جائے ہے
بے طہارت کے نہ جانا شیخ مسجد کی طرف
سجدہ گہ محراب ابرو ہی وضو کی جائے ہے
خاک بھی آیا نہ رستہ عمر رفتہ کا نظر
عاصی اب راہِ عدم بھی ہم سے چھو کی جائے ہے

گل کھل رہے ہیں رنگ میں تر وہ نگار ہے
ہے موسم بہار اور اس پر بہار ہے
مُشت گلال موٹھ سی چلتی ہے بزم میں
ہاتھ اس نگار کا تو غضب سحر کار ہے
خورشید کی ہو جوں شفقِ صبح میں چمک
تابندہ یوں گلال سے رخسار یار ہے
قرباں ہے جس پہ تختۂ صد برگ کی بہار،
دل اس بسنتی پوشش پر اتنا نثار ہے
مُقیش جو اڑائی ہے چمکے ہے برق سی،
بادل گلال رنگ کی پڑتی پھوار ہے
محرم میں دلبروں نے ہیں گیندیں چھپائیاں،
پیچھے نکالا اچی ہیں یہ بے اختیار ہے
ہونی جو کچھ تھی دل پہ سو ہولی ہے اِس گھڑی
عاصی یہ کیا ڈھولنڈی کا دل پر غبار ہے

ڈھولنڈی: ہولی کے تہوار کا ایک دن

پُر ز اختر جب تلک اس چرخ کی جھولی رہے
تب تلک تم کو مبارک موسم ہولی رہے،
جس کے اک چھینٹے سے ہوویں غیرتِ گُل اہلِ بزم
زعفرانِ سوزہ رنگِ عشق میں گھولی رہے۔
سرخیٔ لب سے بتوں کی لعل کے کھٹے ہوں دانت
گوہر پر غالب سخن میں پان کی ڈھولی رہے
جب تلک ہو گا نہیں غنچوں کے زر باد صبا
تو سحابِ فیض رحمت کی تری جھولی رہے
یہ دعا عاصی کی ہے محفل میں تیری روز و شب
بولی ٹھولی میں ٹھٹھولی ہو، جھکا جھولی رہے

میں تو رفیق یار ہوں ناز و ادا تو کون ہے؟
خون ہے میرا اس کے ہاتھ برگِ حنا تو کون ہے؟
فائدہ کیا جو کچھ کہوں تجھ سے نہ ہو گا میرا خون
کشتۂ ناز میں تو ہوں مرگِ وفا تو کون ہے
دود ہماری آہ کا حال دل اس سے کہہ رہا
تو جو رہے ہے پیچ کھا زلف دوتا تو کون ہے
کیا تجھے ہم سے مدعا پند عبث ہے ناصحا
دشمن جاں نہ آشنا پھر تو بھلا تو کون ہے
شب کو جو اُن کے گھر گیا بھیس بدل کے غیر کا
گھر میں سے آئی یہ صدا نام بتا تو کون ہے
صدقے ہیں اس جگر کے ہم سن یہ ہمارے کو ہم
دیکھ کے بولا وہ صنم رو بہ قفا تو کون ہے

چشمِ بلبل سے خزاں آنسو بہانا منع ہے
گل تو آنے دے ابھی سے گل کھلانا منع ہے

غیر کو اتنا بھی صاحب مُنہ لگانا منع ہے
دیدہ و دانستہ عاشق کو جلانا منع ہے

کشتۂ گیسو پہ اپنے نعش پر آنسو نہ ڈال
سانپ کے کاٹے کو دو دن تک نہانا منع ہے

دم لئے رہ زیرِ خنجر مرغِ دل ہنگامِ ذبح
مسلخِ اُلفت میں دست و پا ہلانا منع ہے

دامنِ گل مت جھٹک گورِ غریباں پر صبا
خفتۂ خوابِ عدم کو بھی جگانا منع ہے

شمع گریاں میری بالیں پر نہ لانا ہمدمو
سامنے بیمار کے مغموم آنا منع ہے

وائے قسمت گھیر کر کس جا مجھے لائی قضا
جس قفس میں طائروں کا آب و دانہ منع ہے

عید کا دن ہے ذرا بھولے سے لگ جاؤ گلے
آج کے دن ہچکچانا اور بہانہ منع ہے

بعدِ مُردن اپنے اسکو یار سے یہ ثابت ہُوا
آزمودہ کا یہ سچ ہے آزمانا منع ہے

کون کہتا ہے لگاؤ مت اُس پری سے دل کو تو
منع ہے تو رازِ اُلفت کا جتانا منع ہے

داغِ سوزِ ہجر سینہ پر ہے عاشق کے چراغ
اس جگہ تیز آب کا چھاپا چڑھانا منع ہے

کون پہنچا دے مرے مرنے کی اُس گل تک خبر

واں تلک پیکِ صبا کو بھی تو جانا منع ہے
عاصی اُس گل کو کسی ڈھب رخنۂ دیوار سے
دیکھ لینا فرض ہے آنکھیں لڑانا منع ہے

یہ خاصیت تری اظہر یہاں سے تا بنارس ہے
لگے قدموں سے جو تیرے اسی کا نام پارس ہے
نکالا تم نے ہے جس طرح پر طرزِ خرامیدن
نہ چلتا اس طرح کبک دری ہے اور نہ سارس ہے
خصوصیت نہیں شاہ و گدا پر منحصر ہرگز
جو قعرِ بحرِ دُنیا سے نکل آیا خدا رس ہے
جہاں یکسر معطر ہے نسیمِ خلق سے تیری
تری شیریں کلامی کا ثنا خواں اہل فارس ہے
نہیں تیغِ جفائے چرخ سے کوئی بچا مردم
مگر کتفِ حمایت سے ترے خلقت کو ڈھارس ہے
مہیا ساغر و مینا شراب و شمع ہ شیرینی
تری بزم ظرافت میں کل عاصی کیا رہا رس ہے

عبث کرتی صبا تو وصل کی تدبیر پھرتی ہے
نہیں تدبیر کچھ بنتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے
اِدھر پھرتی زلیخا نالۂ شبگیر پھرتی ہے
اُدھر کملی ہوئے رانجھا کی خاطر ہیر پھرتی ہے
رقیبِ سنگِ طفلاں جذبِ مقناطیس ہے اُلفت
کہ کھینچے تیرے قیدی کو معہ زنجیر پھرتی ہے

یہ داغِ سینہ اک مصباحِ فانوسِ خیالی ہے
کہ فوجِ غم میرے دل کے پٹے تسخیر پھرتی ہے
پھرے آنکھوں میں کس ساعت ہے گردش چشم و مژگاں کی
منٹ پر پاس دل کے سوزنِ دلگیر پھرتی ہے
کیا ہے تیرے دیوانے نے یہ آباد زنداں کو،
کہ موجِ اشکِ مجنوں ہو بپا زنجیر پھرتی ہے
پڑا ہے آشنا اپنا جو گردابِ محبت میں
کہاں تک اسکو کھینچے موجِ بے توقیر پھرتی ہے
لگن میں دیکھ گلرو کی نہ ہو پروانہ سرگرداں
قضائے شمع زیرِ دامن گلگیر پھرتی ہے
بھلا اس گلبدن سے کس طرح پھر جائے دل عاصی
کہیں بھی شاخِ گلُ سے بلبلِ تصویر پھرتی ہے

مری آہِ شرر افشاں سے جگنو گھٹ کے اڑتا ہے
تڑپ سے طائرِ سیماب دل کی ہٹ کے اُڑتا ہے
وہ صیاد سے کیا بلبلوں کا فرقتِ گلُ میں،
صبا صحنِ چمن تک بال و پر سر گٹ کے اُڑتا ہے
تیری عنقائے خوبی کی حضوری میں شہِ خوباں
ہمائے نالہ کمبخت اپنا کھٹ کے اُڑتا ہے
جھلک جاتی ہے اک صبحِ قیامت شام محشر سی
جب اسکا طرۂ زریں برابر لٹ کے اُڑتا ہے۔
ہمارا نائرۂ اعمال اسکی بزمِ عشرت میں
زہے قسمت کبوتر کی طرح پھٹ پھٹ کے اُڑتا ہے

جو مانگو بوسہ دے گالی، بلاؤ تو کہے چل بے
ہمارا ہوش آگے ایسے ہی نٹ کھٹ کے اڑتا ہے
لگے ہے قابلِ انگشت سناں پر خوشنما فندق،
سر پُر خوں تن لاغر سے جس دم کٹ کے اڑتا ہے
شعاع پڑتی ہے جس کے دل میں نورِ ماہِ تاباں کی
وہی نور ، زمیں سے آسماں تک چھٹ کے اڑتا ہے
شکستِ فوجِ اعدا صاف ہوجاتی ہے میداں میں
سمندِ ناز اسکا بیچ میں جب غٹ سے اڑتا ہے
ترانہ سنجِ گل ہو باغ میں تو بلبلِ مطرب،
مگر طاؤس دل بھی ساتھ ہی تڑپ کے اڑتا ہے
دھوئیں کا باندھتا بادل جہاں ہے طفلِ بازیگر
وہاں اپنا دل گم گشتہ عاصی وٹ کے اڑتا ہے

زلفِ سرکش رخ پہ کب تیرے یہ اے جانانہ ہے
اک کماں میں تیر سو جوڑے ہوئے جوں شانہ ہے
گھاٹ کیوں دریائے مے کا بند اے جانانہ ہے
شیشہ جائے بادبانِ کشتیٔ پیمانہ ہے،
تیر کیا سینے سے نکلا دل بھی اے جانانہ ہے
وہ اکھاڑا نخلِ نورستہ کہ جس میں دانہ ہے
جب سے پہلو سے جدا وہ رونقِ کاشانہ ہے
دل کو بھی شوقِ تپیدن جان بیٹھانا نہ ہے
ایک تو کل سے ترے بیکل کو کل آتی نہ تھی
دم نکالے ڈالتا آج اور دردِ شانہ ہے

پوچھتا کب ہے وہ رشکِ گُل کسی عاشق کی بات
اس چمن میں اپنا تو اک سبزۂ بیگانہ ہے

قطعہ

بوسۂ لب میں ترے تاثیر یاقوتی کی ہے،
تو اگر دیدے تو بچتا اِک سُوا مستانہ ہے
ورنہ مرجائے گا یونہی دردِ فرقت میں تیری
پھر کہے گی خلق کس بے رحم کا کاشانہ ہے
معاملہ ہے آدمی کے واسطے سنگِ محک،
اس میں کھُلتی ہے حقیقت آشنا ہے یا نہ ہے
ہے کرشمہ کچھ تو اس محرابِ ابرو کے تلے
شیخ کو مسجد برہمن کے لئے بتخانہ ہے

قطعہ

دین وایماں صبر و طاقت جان و دل ہوش وحواس
طالبِ بوسہ تمہارا دینا یہ بیعانہ ہے
اور کہتا ہے لگاؤ گے اگر تم مجھ سے دل،
دیکھئے گا کیسی جمتی محفلِ شاہانہ ہے
جام و صہبا، قلقلِ مینا، چمن، آبِ رواں،
انجمن آرائے عشرت ساقیٔ فرزانہ ہے
الغرض عیش و طرب کا سب طرح ساماں ہے جمع
اوپری تو اِس پری خانہ میں صاحب خانہ ہے

٭

کوئے دلبر کی منادی سے نہ ڈرتا نامہ بر
راہداری کا تمہارے پاس تو پروانہ ہے

عاصی اک بوسہ جو مانگا تو کہا کس ناز سے
مفت بو تجھ سے بہت دیکھے ہیں چل دیوانہ ہے

چمن ہے مطرب ہے مے ہے مینا ہے موسم برشگال بھی ہے
جو ایسے میں کیجئے عنایت تو آپ سے کچھ محال بھی ہے
جبیں پہ قشقہ سیندور کا ہے برابر ابرو کے خال بھی ہے
سپہر شوکت پہ مہر بھی ہے سہیل بھی ہے ہلال بھی ہے
ہوئے ہیں شمس و قمر فلک پر ضیا سے بس کی جہاں ہیں روشن
اُسی کا ذرہ کے دل میں بیٹھا شرارِ نورِ جمال بھی ہے
تمہاری قم اور لبِ صنم میں بڑا تفاوت ہے اے مسیحا
وہ چاہے دشنام دیکے مردے جلائے سو یہ کمال بھی ہے
جو مرگ سے پہلے ہی مرے ہیں اجل کے ہاتھوں وہ کیا مرینگے
جنہیں ہے دعوائے سربلندی انہی کو ضعف و زوال بھی ہے
ہُوا ہے اس سرزمیں میں قاتل تیرے شہیدِ نگہ کا مدفن
گلال لے کر جہاں کی مٹی بنا نا خوشرنگ لال بھی ہے
ادھر کو آنکلے کاش لیلا ، تو دیکھ سایہ کو ٹھہرے ناقہ
اُسی لیئے اک کھُدا کے کوٹیا لگا یا مجنوں نے جال بھی ہے
رقیب بہکاتا ہے جو اکثر ، وہی تو کرتا ہے اے ستمگر
اسی سبب سے دلِ مکدّر ، تجھے ہمارا خیال بھی ہے
نہ دل کو قوت نہ پاس طاقت نہ خواب آنکھوں میں ہائے فرقت
اجل خبر لے کہ ایسے صدموں پہ جینے جینا محال بھی ہے
رکھو اپنے مطلب سے کام ہمدم پھنسائے دل مت کسی سے ظالم
حصول کر علم و حلم ہردم یہ دولت لازوال بھی ہے۔

یہ توسنِ حسن اک پری رو یہ زلفِ مشکیں و چشمِ جادو
کھڑا ہے بازار پیچ یک سو غرض کہ صاحب جلال بھی ہے
تو چل کے دیکھ آئینہ تو ظالم تیری گلی میں ہے کیا تماشا
سمند بھی ہے کمند بھی ہے، تفنگ بھی ہے غزال بھی ہے
یہی تو ہے سوچ دل کو اپنے اسی کا ہر دم خیال بھی ہے
جو لے گیا بر سے دل وہ دلبر تو پھر نہیں کیا دوال بھی ہے
وہ جھانکتا تھا مجھے کبیلا کھڑے ہو جس رخنہ گذر سے
مذاقِ زنبور وائے قسمت اسی جگہ پر سوہال بھی ہے
اسی کا ہے شش جہت میں جلوہ اسی کا پتھر میں لال بھی ہے
اسی کی آبِ گہر میں تابش اسی کا ابرِ نوال بھی ہے
ہزاروں سرگشتہ و پریشاں لٹک رہے ہیں بزلفِ پیچاں
کمند کاکل ہے اس کی عاصی بچا ہی تو بال بال بھی ہے

حریفِ دل ہے ملامت، دل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے
بہ رشکِ مہرِ کامل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے
بھرا مت تکیۂ الماس کو دل کے پہلو سے
بخشے ہے کاٹنی منزل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے
نہ بھر بندوق چقماقی میں خالی گولیاں ظالم
نہ بارود ہو تو اے قاتل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے
لبِ لعلِ بتاں ہے منعکس آئینۂ دل میں،
نہ ہو زیادہ کہیں شامل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے
تیری راکھی کے گوہر پہ نہ ہوا زیبا گلِ ابرک
بنے گلدستۂ محفل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے

؎ سوہال کی نہیں، شہد کی مکھی۔

قرابی میں اُتاری ناچتی پتلی کسوٹی کی،
بُت بازیگر کامل یہ شیشہ ہے وہ پتھر ہے

وہ مکھڑا انوری فردوسی خط ابروہلالی ہے،
گُلِ عارض چشم جامی وضع سعدی لب زلالی ہے
بشر کی خاک میں اللہ کیا تاثیر ڈالی ہے،
کہ قندیل فلک تک جس کے جلوہ کی اُجالی ہے
مشبک کر کے تیروں سے مرا سینہ لگے کہنے
کہ پہنائی تجھے ہم نے قبائے لوٹ جالی[1] ہے
مری بیتابیٔ دل نے پیامِ وصل کی خاطر
رگِ جاں ملکِ تن میں ڈاک[2] بجلی سی بنالی ہے
خوشامد کی نہیں یہ بات اے ابر کرم سچ ہے
سخی جو دہر میں ہے اس پہ فضل لایزالی ہے
شب تیرہ میں کیا حاجت ہمیں شمعِ شبستاں کی
جو مستغنی ہیں خود دل اُن کا فانوس خیالی ہے
بشر کیسا ہی شر تا ہو پھنسا لو دم دلاسا دے
بنو کچھ تم ستم پیشوں میں وہ صاحب کمالی ہے
سخن کامل ہے جس ماہر کا دارالضرب مضموں سے
غلط ہے افترا ہے کذب ہے باطل ہے جالی ہے
نہ ہووے آب گوہر کم کبھی امساک باماں سے
قناعت پر جو قانع ہیں انہیں کب ضعف مالی ہے

[1] ایک قسم کا جالی دار کپڑا [2] ڈاک بجلی - ٹیلیگراف

نہیں گو فالنامہ پاس اپنے دانیال آسا
مگر نقطوں سے دل کے دیکھتا فرخندہ فالی ہے

اس کی ہے زلفِ دوتا ایک بلا یاد رہے
مار ڈالے گی کبھی تجھکو دلا یاد رہے
کارگر جذبۂ دل ہوگا بھلا یاد رہے
ایک دن آپ کھنچے آئیے گا یاد رہے
بس غنیمت ہے یہ اے رشکِ قمر ہم بزمی
دورِ یکساں نہیں رہتا ہے سدا یاد رہے
جس قدر چاہے تو اب مجھکو ستالے ظالم
ہوگا پر اس کا عوض روزِ جزا یاد رہے

قطعہ

بعد مُدّت کے مرے ہاتھ ہے آیا تجھکو
نہیں چھوڑوں گا ابھی سیمبرا یاد رہے
انتظار آنے کا جتنا ترے کھینچا ہیں نے
بر ہیں اُتنا تجھے کھینچوں گا ذرا یاد رہے
بھول مت اُن کی محبت پہ تو عاصی زنہار
گلرخوں ہیں نہیں کچھ بوئے وفا یاد رہے

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم　　نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
رہے دل ہیں ہمارے رنج والم　　نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
ترے شوق ہیں شب کو جو گھر سے چلے　　تو دو چار عسس سرِ راہ ہوا
دمِ صبح تک آہ پھر اپنی قسم　　نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

کبھی غم سے نہ ہجر کے موئے تھے ہم   کبھی یاد آئی بھی ہنسنے نہ کی
رہے آہ اسی افسوس میں ہم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
کبھی کعبہ میں ہم نے نہ سجدہ کیا   کبھی دیر میں ہم نے جبیں نہ گھسی
کہیں کیا کہ ہمیں ہے دلا یہی غم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
شبِ وعدہ وصل پلک نہ لگی   نہ وہ آیا اِدھر نہ عبادت کی
مِرے دل سے اٹھا نہ خیالِ صنم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
ہمیں گردشِ چرخ سدا تو نے   رکھا صورتِ جنبشِ گہوارہ
ترے ہاتھ سے دنیا میں اکدم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ فلک پہ رسائی کچھ اپنی ہوئی   نہ زمین پہ ٹھہرے ہم ایک جگہ
کبھی سایہ کی صورت ہائے ستم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
ذرا تن سے یہ سر بھی جدا نہ ہوا   رہے حلق بریدہ ہی اے قاتل
کوئی اور ٹکا اب تیغِ دودم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ وصال ہوا نہ وصال ہوا   اسی رنج و عذاب سے اے عاصی
شب و روز بہاتے ہیں چشم سے ہم   نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

تہنیت

کیوں نہ باغِ دہر میں ہو ایسی نعمت کی خوشی
چھائے جب گردوں تلک اس ابرِ رحمت کی خوشی
گر قدم رنجہ کرے ہر طرف وہ باغ میں
تو عروسِ بوئے گُل بن جائے فرحت کی خوشی
دل نہ اتنی ہمت دیکھا رستم و سہراب کا
وقت پر جو ایک سمجھے رنج و راحت کی خوشی

رات کو مشکیں پہ تھا جس دم کہ وہ شاہیں سوار
غش تھی تاریکی پہ اس دم آبِ ظلمت کی خوشی
کچھ کمیتِ ناز کا نے شہسواری کا قصور
رنج قدموں پر گرا تھا کر شجاعت کی خوشی
عرض یہ سب نے کیا جو حکم ہو لادیں بجا،
بہمگیں ہے الغرض کشیِ حمایت کی خوشی
سب کی خاطر جمع کی، سب کا دیا ڈھارس بدھا
دور وے کر چشمِ اُلفت سے محبت کی خوشی
اس کا ہے حمام صحت آج لے یادِ صبا
عطر دانِ گل ادھر لاکر ہنا بیت کی خوشی
قدسیوں کے بھی ہوئی ہے آج بامِ عرش پر
انبساطِ روح افزا اور فراغت کی خوشی
ہے شہنشاہ جہاں اور ملکۂ دوراں ملک
میرزا محمود شاہ سے غسلِ صحت کی خوشی
تو بھی اے عاصی ابھی چل کر مبارکباد دے
پرورش آگئے جو ہو دستِ عنایت کی خوشی
چرخ پر تابندہ ہوں شمس و قمر جبتک رہے
دل پہ میرے قبلۂ عالم مسرت کی خوشی

نظم دیوالی

شباب و شاہد و شمع و شراب و شیرینی
شتاب ایسی شبِ وصل تجھکو دیوالی

کسی نے بھر لیئے دامن حباب شیریں سے
کسی نے جھولیاں بھر بھر کے خوب میوا لی
بلا جو رند سبوکش کو کچھ بھی اس میں سے
تو اس نے آ درِ دولت کی تیرے سیوا لی
مچل گیا مرا پیارا دوکان غازی[1] پر
کرے گا میں تو اجی وہ پری پرے والی
فقیر دوست ہے عاصی نہ روکو آنے دو
کہ کہتا ہے یہ پہیلی اتے پتے والی

سر پر دیہیم خلافت تیرے زیبا ہووے
مسندِ جاہ وحشم زیر کفِ پا ہووے
ظلِّ الطاف سدا تجھ پہ خدا کا ہووے
اور غرباؤں کے سر پر ترا سایہ ہووے
اتنے ہوں لعل وگہر یاں کہ خزانہ تیرا،
رُوکش کان ہو اور ہمسر دریا ہووے
ریں ومساز طرب زہرہ وشاں روز مدام
ساقیٔ ماہ جبیں انجمن آرا ہووے
ماہ کے روپے سے انام رہے نقش ترا،
مہر پہ مہر کے بھی تیرا ہی سکّہ ہووے
ہو سعید عیدِ ضحیٰ تمکو سدا حاتم عہد
ہمکو انعام ملے نام تمہارا ہووے
تندرستی سے رہے جانِ جہاں تو جب تک
تب تلک چرخ پہ خورشید کا جلوہ ہووے

[1] غازی نام ایک مشہور کھلونے بیچنے والے کا، جس کی دوکان دریبہ کلاں میں تھی۔

پنجما ہہ ہیں ملے ایک مہینہ جس کو
تمہیں فرماؤ ہ کہ کیا اسکا گذارا ہووے
لکھ بتبدیل قوافی وہ غزل اے عاصی
ناعیاں حال خداوند پہ تیرا ہووے

جی میں یہ تھا ، کہ کسی کا بھی نہ شکوا کیجئے
تنگ آجائے اگر جان ، تو پھر کیا کیجئے
کب تلک رکھے طرح غنچہ کے مُنہ کو یہاں بند
کب تلک لب روشِش گل نہ بھلا وا کیجے
جب کوئی اور نہ شنوا ہو حضور آپ کے پھر
کس طرح سے نہ بیاں حال کچھ اپنا کیجئے
یہ بڑا حیف ہے اے صاحبِ مسکیں پرور
آپ کے ہوتے تنخواہ کو ترسا کیجئے
چھ مہینے سے نہیں ہم کو ملی ہے تنخواہ ،
کس طرح کیجئے اوقات بسر ، کیا کیجئے
ہیں بڑے آدمی نواب امیر الدّولہ
ہم غریب اُن سے بھلا کیونکہ تقاضا کیجے
اب زرِ نقد ہی تنخواہ دلا دیجے آپ
اپنے عاصی پہ نظر لطف کی رکھا کیجے

قیامت فتنہ زا تو اوسپہر سفلہ پرور ہے
کہ جتنا تو زمیں کے ہے تلے اتنا ہی اوپر ہے
شب فرقت ہے اور دل پر وبالِ زلف یکسر ہے

ستم ہے پا د کالے کا نہ کیٹلی ہے نہ منتر ہے
خدا جانے میاں عاصی دکھاتا کیا مقدر ہے،
جو دہلی سے اٹھا لاکر بٹھایا سوئے جھجر ہے
کیا چشمِ قضا کو لاغری نے میری نا بینا
نہ پاتا ہوں میں بستر پر نہ ملتا تارِ بستر ہے
تصورِ شب کو باندھا دل نے کس کی چشم و ابرو کا
کہ اُترا پُشت ماہی پر سکندر کے لشکر ہے
شب اُس نے توڑ کر تسبیح گوہر دی پرونے کو
فلک یوں ہم سے عینِ وصل میں گنوانا اختر ہے
پیامِ وصل اس گل تک ہمارا کون پہنچائے
نہ مرغ نامہ پر دل ہے نہ چشمِ خضر رہبر ہے
غزل اک اور عاصی تہنیت میں عید کی لکھو
کہ آیا روزِ عشرت غرّہ شوال بن کر ہے

مزاجِ ناخنِ دستِ حنائی کیا فلک پر ہے۔
کہ ماہِ نو دکھاتا روزہ دار عیدِ اکبر ہے
نہ تجھ سا قدرداں کوئی ہے نہ مجھ سا سخنور ہے
ارسطو طبع میں ہوں تو نصیبے کا سکندر ہے
تری بزم طرب انگیز میں روزِ عید کا دن ہے
تجھے جو روز دیکھے اسکو روزِ عید اظہر ہے
تو وہ بحرِ کرم عالی ہمم ہے اس زمانہ میں
ترے قبضہ میں بحرِ پُر گہر ہے کانِ پُر زر ہے
نہ پہنچے صافِ باطن بھی تری روشن بیانی کو

ہ سانپ کے کاٹے کا جنتر یا منتر

صفائے قلب پر تیرے دلِ آئینہ ششدر ہے
کہوں کیا اے صبا اسکے سمندِ ناز کی شوخی
جو کاوا دو بگولا ہے جو سرپٹ دو تو صرصر ہے
میرے چھوٹے میاں تمکو مبارک عید رمضاں ہو
تمہارا بھی تو یہ عاصی دُعاگوئے ثناگر ہے

قطعہ

ظاہرا ہر سو نوید عیش کی تقریر ہے۔
گو ہلالِ عید خامش جوں لبِ تصویر ہے
شیر ماہی کا کہاں ہے دستۂ خنجر ترا،
حق میں اعدا کے تری مچھلی کے اوپر شیر ہے
بادپا تیری سواری کا ہوا سے کم نہیں،
وقت گرمی کے بسانِ برقِ آتشگیر ہے
تجھکو اکبر خاں بہادر عید رمضاں ہو سعید
بس دُعا کرتا یہی اب عاصیٔ دلگیر ہے

قطعہ

تری معجز بیانی برلب گویائے اظہر ہے
دہن ہے نور کا ڈبیہ جبیں ماہِ منور ہے
بڑی بیگم تو اپنے وقت کی ہیں رابعہ بصری
جہاں میں کوئی بیوی زن کہاں تجھ سی میسر ہے
طواف کعبہ ہو تجھ کو میسر دین دنیا میں
دُعا آٹھوں پہر کرتا یہی خسم سخنور ہے
ترے تشریف لانے کو جو دل نے غیب سے پوچھا
ندا یہ غیب سے آئی کہ کرنا فکر بہتر ہے

کہی تاریخ رُوئے لطف سے پھر ہاتفِ دل نے
چلے راہِ خدا پر جو اسی کو حج اکبر ہے۔

قدِ رعنا اگر کہئے الف لیلا سراسر ہے
سہی ہے سرو ہے شمشاد ہے نخل صنوبر ہے
یہی ہے جُوئے شیریں مانگ اسکی راہِ ظلمت میں
مجبور ہے چوٹی اسکی دل کے ڈس لینے کو کافر ہے
کہی یہ طفلِ دل نے جوڑۂ سربستہ پر پھبتی،
یہ عقدِ شب بندھا یا رب پسِ خورشید انور ہے
کہا دل نے جو یہ چین جبیں اسکی سمندر ہے
تو جاں بولی یہ دو ابرو نہیں باب سکندر ہے
بتاتا ہے کوئی ماہی بے خار آنکھ کو اُس کی
کوئی کہتا ہے نرگس ہے، کہ بادام مقشر ہے
لبِ شیریں کو اس کے دیکھ کر کہتا ہے ہر کوئی
یہ فالودہ تراشیدہ ہے یا قندِ مکرر ہے
کوئی کہتا ہے دانتوں کی صفائی دیکھکر ظالم
کہ کوندا برق کا ہے یا صیا ہے سلک گوہر ہے
کوئی کہتا ہے خود بینی سے ایسا اسکی بینی کو
یہ نخل نور ہے یا رب کہ انگشتِ پیمبر ہے
کوئی اس خوبروئی سے کہے ہے اسکے عارض کو
گلِ احمر ہے کوئی عاج ہے ماہ منور ہے
کوئی کہتا ہے ہیں نو، صدف کی کان دو ٹکڑے
کوئی کہتا ہے یہ بیشک دماغِ حسن کا در ہے

وہ مکھڑا جب نظر آیا طلوعِ صبحِ صادق سے
کہ جس خورشید سے ہوتا جہاں سارا منور ہے
ہُوا وہ مطلع برجستہ ظاہر طبعِ موزوں سے
کہ تابِ حسن پر جس کے فدا ہر اک سخنور ہے

بڑا دن اس لئے پچیسویں ماہِ دسمبر ہے
کہ خطِ استوا پر آفتاب آتا برابر ہے،
خوشی دیر و حرم میں کیوں نہ ہر پیر و جواں کو ہو
شبِ فرقت سے گھٹ کر بڑھنا روزِ وصل بہتر ہے
برائے عقدۂ مشکل ترا ہر ناخنِ نصفت
اسد ہے شیر ہے ناہر ہے ضیغم ہے غضنفر ہے
نہ کیونکر شیر و بکری آب پیویں ایک جا آ کر
کہ تیرا عدل کسریٰ سے زیادہ دادگستر ہے
شمیمِ خلق کا تیرے ہی باعث ہے بیاباں میں
کہ نافِ آہوئے چیں سے نکلتا مشکِ اذفر ہے
عطا کیں جب سے تو نے فوج میں کنکیب بندوقیں
عقابِ آسماں تب سے چھپا پردے کے اندر ہے
بکرطہ صید نخچیر کو رکھے دامانِ صحرا میں
ترا ایک ایک شکاری زال و رستم سے دلاور ہے
دمِ جودت قیامت ہے سواری کا ترے توسن
بگولا ہے وہ کاوے میں اگر پھینکو تو صرصر ہے
ہوتی ہے فیضِ بخشش سے تیری دادِ دہش اتنی
کہ کاسوں میں حبابوں کے بھرا دریا نے گوہر ہے

سناؤں مطلع رنگیں وہ لکھ کر طبع حاضر ہے
کہ فیضِ مدح سے تیرے زباں ہوتی معطر ہے

فریدوں بزم آرا رزم طالع کا سکندر ہے
کہ جس کا نام تھیا فلس مشکت بہادر ہے
یہ وہ ذیشاں ہے عالی خانداں اس باپ کا بیٹا
کہ وہ فرزند مقبول شہنشاہ مظفر ہے
رہے روشن الٰہی اُس کے نورِ ذات سے خلقت
غنیمت ہے سوادِ ہند میں ماہِ منور ہے
دُعا سے میری تیرا روز افزونی پہ نمبر ہے
ہوا چاہے تو ابکے سال نواب گورنر ہے
خزانہ کیا کہوں تیرا خط ابجد سے باہر ہے
گدا ہے جو تیرے در کا وہ رشک کیمیا گر ہے
نگاہ لطف سے خالی نہ رکھنا ہم غریبوں کو
کہ تکیہ اب تو غرباؤں کا اے صاحب تجھی پر ہے
پس از مدّت حضوری میں تیری فریاد لایا ہوں
کہ میرا حق تلف ہوتا خموشی میں سراسر ہے
کہاں جاؤں ہمیں فریاد اس پیری ضعیفی میں
نہ تجھ سا قدرداں کوئی ہے نہ مجھ سا سخنور ہے
کہو اتنا تو منہ سے ہاں قدیمی خانہ زادوں ہیں
تو اے عاصی مقرر ہے مقرر ہے مقرر ہے

اے صبا پھر کوچۂ جاناں میں جانا چاہیئے

طائرِ برگشتہ اپنا آزمانا چاہیئے
چھوڑ جاناں نیم جاں مجھکو نہ جانا چاہیئے
اور بھی اک ہاتھ تیغے کا لگانا چاہیئے
عارضِ تاباں کے آگے دل کو لانا چاہیئے
غرۂ حیرت نظر اُن سے کرانا چاہیئے
دردِ دل سن کر میرا شاید کہ رحم آئے اُسے
کچھ تو احوالِ حزیں جا کر سنانا چاہیئے
باتوں باتوں میں بھلا کر اسکو اے بادِ صبا
پاس تک میرے کسی ورٹ کھینچ لانا چاہیئے
اس قدر صیاد بے رحمی پہ مت باندھے کمر
تو گرفتارِ قفس کو آب و دانہ چاہیئے
اپنے عاصی پر بھلا آزردہ خاطر کیوں ہوئیے
بے سبب بن بات عاشق کو کڑھانا چاہیئے؟

ٹانکے کہاں چھپیں تن پہ نمایاں نئے نئے
کے ہیں چشمِ زخم پہ مژگاں نئے نئے
تِل کب ہیں زیبِ عارضِ جاناں نئے نئے
بیٹھے ہیں در پہ حسن کے درباں نئے نئے
وحشت میں دل ہے دل میں ہیں ارماں نئے نئے
جنگل میں گھر ہے گھر میں ہیں مہماں نئے نئے
لیلیٰ ہے ہیچ کہ قیس کے صحرائے نجد میں
پاؤں پڑے ہیں خارِ مغیلاں نئے نئے
دل میں بسا ہے کوئی پریرو کہ رات بھر

دیکھا کیا میں خوابِ پریشاں نئے نئے
زاہد پھنسا ہے آن کے محفل میں اے جنوں
خوش ہو، کہ ہاتھ آئینگے داماں نئے نئے
اچھے جھنکائے چشمِ زلیخا کو عشق نے
یوسف کے غم میں چاہِ زنخداں نئے نئے
کس طرح سے گذر ہو درِ کوئے یار تک
درباں نئے نئے ہیں نگہباں نئے نئے
شبنم نہیں ہے غنچۂ بشگفتہ میں صبا،
اِس طفل نے نکالے ہیں دنداں نئے نئے
مژگاں پہ اس کے اشک دمِ سرمہ دیکھئے
تیروں کے سر پہ آتے ہیں پیکاں نئے نئے
رویا تھا کب میں کوچۂ جاناں میں بیٹھ کر
عاصی اُٹھے ہیں مجھ پہ جو طوفاں نئے نئے

آئینہ رُو جو آئینہ سے دو بدو ہُوئے
نازاں تھے اپنے حسن پہ آپ ہی عدو ہُوئے
غش تجھ پہ کیا ہم آج بُتِ ماہرو ہُوئے
سرگشتہ گردباد نمط چار سو ہُوئے
کھایا یہ خاک نے کہ ہر ریزہ استخواں
موران قبر کے بھی نہ آنسو فرو ہُوئے
اللہ رے کاوے کاوے کہ ہر اک نفس کے ساتھ
الماس پارہ تھے کہ نبازگلو ہُوئے
پھونکا جو میں نے سورۂ اخلاص کر کے دم

ناپاک تھے کہ دل میں ذری باوضو ہوئے
توڑے اس اضطراب نے سب بخیۂ جگر
بار دگر نہ رشتۂ جاں سے رفو ہوئے
عاصی سنا ہے شب کو بنت العنب کے ساتھ
تم بھی تو دستِ بیعتِ دستِ سبو ہوئے

مخمس بر غزل محرم

سوسن نے زبانِ رنگیں سے کیا طرز نکالی پھولوں کی
نرگس کی آنکھوں میں ہے کھلی اب شان نرالی پھولوں کی
غنچوں نے چٹک کر بادِ صبا بجوادی تالی پھولوں کی
رخسار وہ گل تھا جس سے ہوشرمندہ لالی پھولوں کی
اُس گل پر گلزار کھلے تھے کان میں بالی پھولوں کی

اکبار جو دیکھے غش کھاوے کیسا ہی ہو زاہد وارستہ
وہ اُٹھتا جوبن قہر بلا اک قد تھا قیامت برجستہ
انداز نکالا تھا اُس پر بہرِ تسکین دلِ خستہ
اللہ رے کافر جیب تختی اور سر سے قدم تک گلدستہ
وہ سیب سی پستان اٹھی اٹھی اور ہاتھ میں ڈالی پھولوں کی

شب جذبۂ عشق کی دولت سے گھر آکر گلے اُسکے لپٹے
جتنا کہ بُرا اس گل سے کہا غم کھا کے گلے اُسکے لپٹے
سو زخم لگے پروانہ نمط پر جا کے گلے اُسکے لپٹے
گل ہار کے آخر ہار بنے اور آ کے گلے اُسکے لپٹے
بے حال ہو رشتہ میں گوندے جب ہوئی بجالی پھولوں کی

جس رشکِ گل کے غمزہ کی اغماز کے ہووے دل صدقے
اس عشوہ گری پر جان فدا اعزاز کے ہووے دل صدقے
کس طرح نہ قرباں اے ہمدم ہمراز کے ہووے دل صدقے
اس آن کے ہیں قربان گیا اس ناز کے ہووے دل صدقے
بس دُور سے دیکھا جب مجھکو اک چھڑی اُٹھالی پھولوں کی

تھا حسن ببھوکا ایسا ہی اس گورے گورے مکھڑے پر
جس عارض سے ہیں نورِ ضیا ہر صبح و مسا اُٹھ شمس و قمر
واروں اُسکے دُرِ دنداں پر کس طرح نہ اب سلک گوہر
وہ صاف بدن اور نازک تن جس پر کہ نہ ٹھہرے آہ نظر
اور تس پر ہووے جال دلوں کی کرتی کی جالی پھولوں کی

اس باغِ بہارِ مخمس کی عاصی نے رکھی کیا طرزِ ستم
رکھتے ہیں اپنے وردِ زباں جو شایق ہیں اس کو ہر دم
تصویر اگر کھینچے مانی ہو جائے زبانِ خامہ قلم
وہ شوخ پری تو سر تا پا گل سے ہے نازک اے محرم
گلچینِ جہاں یہ نذر کو تیرے لایا ڈالی پھولوں کی

مخمس بر غزل مصحفی

ہم نے کل ملکِ فراست میں ہی ڈھونڈا آدمی
پر نہ پایا اور پری رخسار تجھ سا آدمی
ہند میں مشکل سے ہاتھ آتا ہے دانا آدمی
آدمیت سے بھرا ہو جو سراپا آدمی
یُوں بچھڑ جائے یکایک ہائے ایسا آدمی

کیوں عزیز و چاہ زنداں میں اسے ڈالا ہے مُفت
کاروانِ عشق جو تقدیر سے لایا ہے مُفت
ہاتھ آتا اب ترے یہ حسن کا دریا ہے مُفت
اے زلیخا جان اس سودے کو تو سودا ہے مُفت
چرخ نے یوسف سا تیرے ہاتھ بیچا آدمی

جنگ جو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
تُند خو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
ماہرو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
خوبرو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
آج تک ہم نے دیکھا تجھ سا نہ دیکھا آدمی

دھیان بیچ ہے اس کے چشم ابھی کھیل و ہنار
طور پر آتش ہوئی قدرت سے جس کی گلعذار
ربِ اغفر مالکِ ہر دو جہاں پروردگار
خاک کو میری وہ گر چاہے کرے باغ و بہار
وہ جو مشت خاک سے کرتا ہے پیدا آدمی

دفعتہً اُٹھا شبِ فرقت میں وہ جذبِ جنوں
جو بھلی کہتا تھا گتی تھی وہی زشت و زبوں
داستانِ قتل بے جا والہ سے کیا عاصی لکھوں
تو گیا اُدھر کیا یہاں مصحفی نے اپنا خوں
سچ ہے پیارے کیا کرے جی کر اکیلا آدمی

مسدس

عشقِ خوباں میں ہوں کیا از خود رسیدہ آدمی
دید کا ہوں مہ جبینوں کے ندیدہ آدمی
دہ رہِ اُلفت میں تھوں محنت کشیدہ آدمی
سو جہاں دیدوں میں چیدہ برگزیدہ آدمی
عاشقوں میں وہ جو ہیں دو چار چیدہ آدمی
میں بھی ایک اُن میں سے ہوں آفت رسیدہ آدمی

چاہ میں یوسف کے تھی گرچہ زلیخا مبتلا
ہجرِ لیلا میں سہے مجنوں نے تھے رنج و بلا
شمع پر مر کر دیا پروانہ نے جی کو جلا
شاخِ گُل پر بیٹھ کر بلبل سے غنچہ نے کہا
عاشقوں میں وہ جو ہیں دو چار چیدہ آدمی
میں بھی ایک اُن میں سے ہوں آفت رسیدہ آدمی

وہ شرارِ عشق کا دل میں ہے اک داغِ کہن
وشت میں لالا لگا وے کوہ سے لعلِ یمن
کھینچ لائے راجہ نل کو جانب قصرِ دمن
نجد کے بن میں کبھی تھا قیس با رنج و محن
عاشقوں میں وہ جو ہیں دو چار چیدہ آدمی
میں بھی ایک اُن میں سے ہوں آفت رسیدہ آدمی

عشق نے کھولا سرِ فرہاد پر شیریں کا راز
عشق ہی لایا دلِ محمود کو سوئے ایاز
عشق کی دولت لگی رانجھا پہ کرنے ترکتاز
عشق کے ماروں کو بخشے گا تو ہی لے بے نیاز
عاشقوں میں وہ جو ہیں دو چار چیدہ آدمی

میں بھی ایک اُن میں سے ہوں آفت رسیدہ آدمی

سینہ داغوں سے ہے میرا اس لئے رشکِ جناں
شاید آنکلے پئے گلگشت وہ سروِ رواں
حُسن کے در پر بٹھا کر خسال ہند دپاسباں
پھر کہوں عاصی ہوں غش ہوں لوٹ ہوں میر یجاں
عاشقوں میں وہ جو ہیں دوچار چیدہ آدمی
میں بھی ایک اُن میں سے ہوں آفت رسیدہ آدمی

متفرقات

غزلیات

بوسہ کا سوال اس سے کیا دیکھیئے کیا ہو — دیتا ہے کہ ہوتا ہے خفا دیکھیئے کیا ہو
کچھ بن نہیں آتی ہے دلا دیکھیئے کیا ہو — آتا ہے کہ جاتا ہے بھرا دیکھیئے کیا ہو
دل ہوتا ہے دلبر سے جدا دیکھیئے کیا ہو — بچھڑے ہے رفیق اپنا خدا دیکھیئے کیا ہو
ہے شورِ نمک پاشیٔ قاتل سے مچا نا — ہر زخم جگر اسکا۔ مزا دیکھیئے کیا ہو
ہم جان کے خون ل گئے تھے جھڑکیاں انکی — یاں تک تو ہوئی اسکے سوا دیکھیئے کیا ہو
جس شوخ کی خفگی میں یہ باتیں ہیں قیامت — نازو ز جوانی وہ بھلا دیکھیئے کیا ہو
مرجانا ہی بہتر تھا مرا اسے شبِ ہجراں — اب ڈر ہے مجھے اسکی سزا دیکھیئے کیا ہو
ہے آج یہ صورت ترے بیمار کی تجھ بن — جس نے اسے دیکھا یہ کہا دیکھیئے کیا ہو
کیونکر نہ مجھے خار ہوں ادن دلیت کے مجھ نے — اس گل کی ہوں نظروں سے گرا دیکھیئے کیا ہو
اس تیغ نیوں رہتا ہوں پریشان میں اکثر — دل زلف میں اسکی ہے پھنسا دیکھیئے کیا ہو
بیماریٔ دل تم سے نہیں جانے کی ہرگز — اسے چارہ گرو اسکی دوا دیکھیئے کیا ہو

اے عاصیؔ کٹا دن تو بہرحال تڑپ کر
اندیشۂ شب اَور رہا دیکھیے کیسا ہو۔

کسی کا تجھ پہ جادو سیمبر ہووے تو میں جانوں
رضائے حق پہ راضی رہ ضرر ہووے تو میں جانوں
جُدا تجھ سے کبھی دلبر اگر ہووے تو میں جانوں
زباں پر لا نہ شکوہ کچھ خطر ہووے تو میں جانوں
بٹھا دوں وصل کی شب میں سیہ بختی کو گر اپنی
قیامت تک پھر اس شب کی سحر ہووے تو میں جانوں
لگالے خال کاجل کا قریب اس چشم میگوں کے
پری رُو پھر کبھی تجھکو نظر ہووے تو میں جانوں
میں وہ سوزِ دروں رکھتا ہوں سینے میں تپِ غم سے
علاج اسکا مسیحا سے بھی گر ہووے تو میں جانوں
چھپایا رازِ اُلفت چشم سے ہے سات پردوں میں
تجھے اس بھید کی مردم خبر ہووے تو میں جانوں
خدنگ عشق کھاکر کوہکن کہتا تھا یُوں ہر دم،
کہ اس لذّت کا شیریں نیشکر ہووے تو میں جانوں
جُدا مت اس خدا سے رہ لگائے شمع ساں رکھ لَو۔
پھر اس دُنیا میں گر تجھ سا بشر ہووے تو میں جانوں
یہ کڑوے زہر کے دو گھونٹ پی لے ساغرِ غم سے
مِرا دم جو پھر دردِ جگر ہووے تو میں جانوں
کہیں عنقا برائے نام ظاہر ہو تو ہو شاید
مگر اُس یار کی بیرے کمر ہووے تو میں جانوں

ہم عاصی جانتے ہیں خوب اُس شوخ ستمگر کو
جو اِس جانب کا کچھ بھی دل میں ڈر ہووے تو میں جانوں

اشعار

تا سیہ اُس کے رُخ کی وہ ہے زلفِ دوتا میں بجلی
چمکے نہ جس کے آگے کالی گھٹا میں بجلی

صبح گر تو مہ جبیں اشنان کو جمنا پہ جائے
مہر چندن گھس کے ماتھے پر تلک تیرے لگائے

در پردہ ہم جو زلف لگے اسکی بھانپنے بولے کہ تجھکو سونگھ لیا کالے سانپ نے

قیامت کیا فقط پوشاک ہی تیری یہ دھانی ہے
دوپٹہ آسمانی بھی بلائے آسمانی ہے

آپ ہی ٹک اپنی ابروئے پرخم کو دیکھئے تیغ دودم کو دیکھئے اور خم کو دیکھئے

تڑپتے ہی رہے پہلے تو مُنہ لگا نہ کرے ملا جو دل تو وہ برسوں تلک ملا نہ کرے

وہ بے وفا ہے کہ دل سے کبھی وفا نہ کرے خدا کسی کو کبھی تجھ سے آشنا نہ کرے

تپِ غم سے یہاں کیا اشکِ خوں آلود نکلے ہے
کہ جانے نالہ سینے سے ہمارے دود نکلے ہے

یارو بزم عشقبازاں شب کو کیا درپردہ ہے
دیکھ تجھکو شمع فانوسِ خیال افسردہ ہے

کہاں سرو چراغاں بزم میں چمکیں ہیں انجم سے
زمیں ہم چشم ہوتی دیکھ لو اب چرخ ہفتم سے

ہنسیں یہ دو دسرے شمع کے یارو نکلتا ہے
گئے سے تھا کہ اندھیرے کو اُگلنے پہ اندھیارے ہے

نمایاں ہیں کہاں ٹانکے ہمارے زخم کاری کے
یہ جوہر رہ گئے ہیں میرے قاتل کی کٹاری کے

عارض کو اپنے باخطِ ریحاں دکھایئے   رکھ رحلِ آبنوس پہ قرآں دکھایئے
دُر دُر ہی کر کے ٹک دُرِ دنداں دکھایئے   آنکھیں تو اس قدر نہ مِری جاں دکھایئے
بوسہ لئے بغیر نہیں چھوڑنے کے ہم   اس وقت ڈر کسی کا نہ جاناں دکھایئے

حیف ہے ہم تم نہ رکھیں وصل میں دل ایک سے
اور ہوں دو شیشہ ایک ساعت گلے مِل ایک سے

مسی مالیدہ دنداں پر وہ جس دم پان کھاوے ہے
شفق اور ابر کے پھر بیچ ہیں تارے دکھاوے ہے
بسنتی پوش بن کر گلبدن جس وقت آوے ہے
ہتھیلی پر طرح نرگس کی پھر سرسوں جماوے ہے
خطر کیا میری گردن پر جو تلوار اب لگاوے ہے
میں جوہر آزماتا ہوں وہ تیغ آزماوے ہے

کیا عجائب ہے یہ جھومر کی تیرے مہ پارہ ہے   مانگ ہے نہر اسکی لڑیاں ہیں اک فوارہ ہے
دل ہے تاثیرِ محبت ہی سے جذبِ عاشقی   صورتِ لیلیٰ کھنچی اب تک رگِ مجنوں میں ہے
لگتے ہی دل ہوئی جو جدائی حبیب کی   قسمت کی گردش اپنی بُرائی نصیب کی

شمیم نظم تر سے کیوں نہ تازہ نشر گردوں ہو
میں وہ ہوں تاجدار معنیٔ مُلکِ سخندانی

معطّر ہو سرِ خوانِ مضامیں پر مری ہر دم   کرے ہے دستِ فہم طور سینا بھی نگس رانی
صفت مژگاں کوتاہ تو کسی نے بھی نہیں باندھا   نگہبانیٔ طفلاں پر یہ دعوائے زباندانی
سراج الدین بھی لکھتا ہے یہی تشبیہ کی جا پر   کہ اپنے دیکھنے میں ایسا کم آیا ہے اے جانی
کسی کا نام اک اطلاق کرتا ہے زمانہ پر   خدائی کا کرو نہ غوغہ ہی ہے کچھ مسلمانی
نہیں جو دیکھنے میں اپنے آیا اسکو یہ کہنا   کہ تشبیہات میں لایا ہو شاید بکلوئے[۱] ثانی

۱ ایک شاعر تھا

نہیں تشبیہ ایسی کوئی ہوگی جو نہ دیکھی ہو
یہی لکھتے ہیں عاصی حضرتِ سعدی و خاقانی

رازِ دل سینے سے اُٹھ کر جب زباں پر آئے ہے
لب تلک آکر سخن اُلٹے ہی دم پھر جائے ہے
شرحِ بختِ حالِ محزوں جب رقم ہو جائے ہے
کلکِ تیرِ بازگشتی ہاتھ میں بن جائے ہے

ہیکلی اشک کو کیا دیدۂ نمناک میں ہے ایسی کَل کَل ہے کہ کَل سے مرا دم ناک میں ہے

خیالِ نوکِ مژگاں میں جو عاصی سانس اُچھلے ہے
تو اس دم یہ دلِ بیتاب دو دو بانس اُچھلے ہے
مریضِ عشق کے جینے کا تیرے کیا ٹھکانا ہے
کہ دو دو دن سے یہ حالت ہے پانی ہے نہ دانہ ہے

فرد

آبی محرم گوری کچ اور تس پہ سنہری گوٹ لگی
ابر میں آیا چاند کا ٹکڑا برق کے دل پر چوٹ لگی

فرد

جو سرکش زلف کو دیکھا تو پائے کو بلا سمجھے
اسے طوقِ گلو جانا اُسے زنجیرِ پا سمجھے

دلا آئی سفیدی عمر کیوں غفلت میں کھوتا ہے
چل اُٹھ صبحِ قیامت ہو گئی کس نیند سوتا ہے

سنا ہے آج تیغا جنگجو کا بن کے آیا ہے۔
یہ مقتل میں یہ رے پیاسا لہو کا بن کے آیا ہے۔
نہ سمجھو ماہِ نو انجم شناسو اسکو گردوں پر[1]
یہ اس کا ہی گریبانِ شلو[2] کا بن کے آیا ہے

[1] جوتشی [2] ایک قسم کا کرتا۔

غزل فارسی

بریدازمن پری رخسار یارسست پیوندم
کہ چوں دیوانہ خود بر خود گہے گریم گہے خندم

بزلفِ آں صنم دل بستہ ام برمن روا باشد
اگر تسبیح بکشایم، دگر زنار بربندم

پسندم گر جُدا سازند بند از بندِ من اے یار
صبوری از تو نتوانم جدائی از تو نہ پسندم

چو بکشودم برویت دیدہ بستم از رُخِ خوباں
چو پیوستم زمہرت، دل زمہر مہوشاں کندم

گرانی ہائے بارِ عشق را غافل چہ می داند
کہ چوں باشد تن کاہیدہ زیر کوہ الوندم

دوچنداں آتشم زیں باد کردی تند اے ناصح
ملامت میکنی تاکے نصیحت میکنی چندم

برہمن گشتہ ام تا جلوہ گر گردیدہ عاصی
بُت بے مثل مانند از لباس مثل و مانندم

غزل در صنعت رقطع

(یعنی ایک حرف منقوطہ دوسرا غیر منقوطہ)

زد خدنگِ غمزہ برجانم خوشا جانانِ من
منصبِ عشاق مشاقِ وفا شد زانِ من

میکشد قلبم زسیرِ غمزہ جوئے آبِ خوں
مشربِ آشوب لیلامی ربایدشانِ من

صبر از ایوّب وز یعقوب سیلِ غم بدید
قلب آخر شد ز وجہش سیرِ باغستانِ من
می گزد بر شدّتِ افعی سیہ زلفِ صنم
زانکہ شوقِ طبع زاہد جان کند قربانِ من
از رُخ آں آزری رُخ اشک خوں دیدیم بس
خلعتِ طبعی کند زو تازہ تر بستانِ من
میکند بر پا قدِ شایستہ نازک تر زو شک
قوتِ سیرِ چمن از من ستاند جانِ من
کے کشاید قلبِ من از دیدنِ صنعِ چمن
لیک بکشاید خدشش حیرت کند یستانِ من
طبع ذوقِ دیدنِ لبِ سنگ بر خمخانہ زد
خستگی اے میکشاں دیدیم زو شایانِ من
از صنوبر فرق با قدِ تو شد خوشش وضع تر
خدِ تو یاقوتِ صبح جاں کشا تابانِ من
اے لبِ عنابِ سیرت آب و تاب مے ہمیر
باد از رنگِ خمیرِ پُر غمیم بریانِ من
عقل تابِ کُنہِ ذاتِ حق کجا یابد بعزم
چوں صفات از کثرت حیرت کند پایانِ من
عاصیا جاں کے ربا بد ذوق از آبِ حیات
کز لبِ آں سیر شد جانِ منم جویانِ من

قصیدہ

در مدح راجہ بنے سنگھ والئ ریاست الور

ہمائے اوجِ سعادت بہ نیرِ اقبال / ہُوا ہے سایہ فگن آکے بر درِ اجلال
کہے ہے یُوں وہ سمجھ اسکو آشیانۂ قدس / یہیں رہوں گا سدا میں بہ یُمنِ صد اقبال
نسیم صبح نے دی ہے مجھے خوشی کی خبر / کھلا بروئے جہاں ہے درِ سرورِ اشتمال
چمن میں قہقہۂ گل ہے، نغمۂ بلبل / صدائے قلقلِ مینائے مُل ہے موجِ شمال
کچھ ابکے قوتِ روئیدگی سے دور نہیں / نکال لائے اگر برگِ سبز شاخِ غزال
کیا ہے ابرِ کرم نے جہاں کو سر تا سر / ہر ایک قطرۂ رحمت سے اپنی مالا مال
بچھایا سبزۂ نورس نے فرشِ مخمل کا / بہایا گوہرِ شبنم نے بحرِ آبِ زلال
زبس ہے کشتِ محبت کو ربطِ بالیدن / زمینِ حسن میں ہوتا ہے سبز دانۂ خال
بنائے صانعِ قدرت نے گل کے گل اس سے / نہ دے ہر ایک کی ہر ایک کو ہر اک سے مثال
ہر ایک پیر و جواں نشۂ نشاط میں مست / ہر ایک پیر و جواں اپنی چال میں خوشحال
پئے نظارۂ گلشن بس عین شفقت سے / صبا نکالے ہے بلبل کی آنکھ سے پر بال
لگا ہُوا ہے اِسی تاک جھانک میں انگور / کہ شادوں خوردۂ مینا کریں جو برگِ نہال
ہَوا کو بخشی رطوبت نے جانے کیا تاثیر / کہ خط سے سبز ہوئے سُرخ سنغچوں کے گال
بسنت لائی ہے سرسوں جما ہتھیلی پر / نظر جو مزرعِ دل میں پڑی ہیں جو کی بال
کھڑے ہیں سرو و صنوبر جما کے پلٹن کو / جلوس بادِ بہاری کے بہرِ استقبال
چنبیلی، سوتیا، نسرین بہ سوزنِ مژگاں / بناتی رشتۂ سنبل سے ہیں گلوں کا خال
گلاب، کیوڑا، چمپا، ہزارا نافرمان / سکھاتے بچۂ طاؤس کو ہیں رقص کی چال
درخت رنگترے کا بہ حسن و رعنائی / رکھے ہے درجِ شفق میں بنا کے برجِ ہلال
چکوترہ جو رکھے سر پہ کجکلاہِ نمد / کٹھل نہ چادرِ الفی کو لیوے سر پہ ڈال
رہا نہ سیب کو آسیب دیکھ رُوئے بہی / جو خرمی ہُوئی خرما کے ہر شجر کو کمال

وفورِ عشق سے پستہ رہا دہن بستہ
دکھائی ناز سے بادام نے جو چشمِ[۱] وصال

مہک گئی چمنستاں میں بوئے عطرِ سہاگ
عروس بادِ بہاری نے پہنا جوڑا لال

کہا شریفہ نے کیلے سے یوں اکیلے ہو
یہ حکم عام بہ جا ہے لائے بار نہال

ہر ایک ذات میں ہو جائے لذت لوزات[۲]
ہر ایک بات میں دے گوٹ کر نبات کو ڈال

ترنج و نار اکٹھے نہ ہوں رہیں یونہی
ککڑی خموش رہے کولے[۳] سے لگی چھنال

وفورِ جوشش میں تکیہ[۴] ہے نخلِ خوارہ
کہاں سے لاؤں میں اسکی کوئی نظیر و مثال

زمیں میں رکھ کے خزانہ فلک پہ اڑتا ہے
لگا کے شہپرِ عنقا بسانِ طیرِ خیال

جب اس روش پہ نظر آیا جلوۂ رنگیں
تو باغباں سے کیا طوطیِ خرد نے سوال

مجھے بتا تو سہی اے مرے رفیقِ شفیق
وہ کون آئے ہے ایسا بگلشنِ آمال

کہ جس کے لطف سے زر ہے گرہ میں غنچہ کی
کہ جس کے جود سے تازہ ہے کائناتِ جمال

کہ جس کے خلق کی ہے خلق میں بھری خوشبو
کہ جس کے ابرِ کرم سے ہے تر غبارِ ملال

بجے ہے جس کا سدا کوسِ عدل پر ڈنکا
لگا کے شرق سے غرب اور جنوب سے بہ شمال

وہ عرش مرتبہ، کیواں حشم، فرشتہ سیر
کہ جس کے عہد میں آسودہ ہو گئے کنگال

دیا جواب کہ آتا ہے وہ سکندر بخت
خوشا سعادتِ طالع زہے ہمایوں فال

پڑھوں میں مطلعِ نو باغِ مدح میں ایسا
سرائیں سن کے جسے طوطیانِ قند مقال

مطلع

وہ راجہ اندر مہاراجۂ خجستہ خصال
بنام راجہ بنے سنگھ صاحبِ اقبال

یہ تیغِ برق پڑے جس پہ تیری وقتِ جدال
سرِ عدو بشکل ہو بھر اک سا چنا دو دال

جلوس تیری سواری کا گر رقم کیجے
نکال ہر بنِ مو سے زبانِ ناطقہ لال

تو شہسوار ہوں حد شمار سے باہر
پرے قطار سے جاوے قطار اشترنال[۵]

---

۱ اُمید ۲ برفی مٹھائی دودھ کی ۳ کولا۔ نارنگی کی ایک قسم ۴ بے نظیر۔
۵ اشترنال:۔ چھوٹی توپیں۔ زنبورک

شکوہ فیل ہے معجز نشان و فکر بلند
اِسی لئے اسے کہتے ہیں سب فلک تمثال

سجے ہیں سر پہ مکٹ پھول مال گجگاہیں[1]
چلے ہیں جھومتے مدھ بن سے اوڑھ چادرِ شال

نہ سمجھو دانت یہ دو مُرلیاں ہیں چاندی کی
کہ یہ گنیش کے ہیں بھیس میں کنہیا لال

وہ باد پا ہے سواری کا تیری باد سے تند
قدم زمیں پہ لگاوے نہ تا رہِ صد سال[2]

فلک پہ کاہکشاں ہے ترا لوائے بلند
تنا طنابِ زمیں سے ہے لنگرِ اقبال

ترا ہی قطرۂ رحمت ہے بحر میں گوہر
ترے ہی نور کا شعلہ ہے دل میں کوہ کے لال

مدادِ[3] کوہ ہو، اور بحرِ کشتیِ داوات
زمیں ہو صفحۂ کاغذ قلم ہو شاخِ نہال

شبانہ روز لکھے تیس پہ منشیٔ تقدیر
مگر نہ پائے کبھی تیرا انتہائے کمال

شمیمِ خلق سے تیری جہاں معطر ہو،
نسیمِ صبح رہے تا گلوں کے شامل حال

تری حضور رہے سرخرو سپہرِ بلند،
ترے کمال پہ غالب آئے عین کمال

سرورِ عیش تجھے نخلِ عمر سے اپنی،
رہے بفضلِ خداوندِ ایزدِ متعال

بعدل ثانیٔ کسریٰ بہ بزم ثانیٔ جم،
بدادِ حاتمِ دوراں بہ رزم رستمِ زال

بہم ہیں ذاتِ مبارک سے یوں صفاتِ صفا
کہ جوں شباب میں مل کر گھر گھر میں ڈالی[4]

بجا تا ہو درِ دولت پہ چرخ گھنٹہ یالی
طلا و سیم کے شمس و قمر کے دو گھڑیال

دُعا پہ ختم سخن کر دعائیہ یہ ہے
کہ دوست ہوں ترے شاداں عدو رہے پامال

ہر ایک لحظہ و ہر دم تجھے مبارک ہو
دیارِ ہند میں رہنا بحشمت و اجلال

نہ اُترے رنگ قصیدے کا تیرے حاسد سے
کہ شوخ ہی نظر آیا کرے بہ رنگ آل[5]

قصیدہ کرد رقم بر سبیلِ استعمال
بسنہ پنجہ و نہ یک ہزار دو صد سال

---

[1] سر اگائے کی رسم کی جھنور جو ہاتھی کے دانتوں میں اٹکا دیتے ہیں۔ خوبصورتی کیلئے
[2] سو سال کا راستہ بغیر زمین پر قدم رکھنے کے طے کر لے [3] سیاہی [4] جھک
[5] ایک مشہور درخت جس کی جڑوں سے سرخ رنگ نکلتا ہے۔

شاہنامہ

(نسب نامہ خاندان مغلیہ)

حضرتِ تیمور شد والا گہر — بعد ازاں میراں شہِ نیکو سیر
بوسعید آں خسروِ عالی مقام — پس عمر شیخ آں شہِ فرخندہ جام
بابر غازی شہِ عالم پناہ — شاہ دیں پرور ہمایوں بادشاہ
بعد از ایشاں بود با تخت و کلاہ — ناصرو بادین اکبر بادشاہ
شاہ نور الدیں جہانگیرِ سعید — بعدہٗ شاہِ جہاں شاہِ حمید
بعد ازاں اورنگ زیبِ غازیاں — بُرد زیں عالم متاعِ آں جہاں
بعد از ایشاں چوں بہادر شاہ بود — دولتِ دنیا و دیں با خود ربود
بعد ازیں سلطانِ دیں فرّخ سیر — در سخاوت از ہمہ شد تاجور
بعد ازیں جملہ محمد شاہ بود — کرد احمد شاہ بعد از او نمود
بود عالمگیر ثانی با کلاہ — بعد از آنہا شاہ عالم بادشاہ
عارف باللہ اکبر شاہ بود — در سخاوت جملہ شاہنشاہ بود
صدر جنت باد یارب جائے شاں — روضۂ خلد بریں مادائے شاں
تاج و تختِ ہند یارب تا سما — بر بہادر شاہ بادا دائما!

عاصیِ دہلی برائے یادگار
زد رقم ایں اسمہا بر شمار

رقعہ بنام حافظ بہاؤ الدین

مشفق و اشفق، شفیق و مہربان مخلصاں
یعنی حافظ جی بہاؤ الدین صاحب قدر داں

آپ کا اک ذرّہ لکھے بھی اگر وصفِ بیاں
پرتوِ اخلاقِ معنی سے بھریں صد کارواں
انوری چہرہ خطِ ریحاں نہ فردوسی سے کم
لب ہلالی دو نو رخسارے گلستاں بوستاں
اس کی ہمت سے تو اے عاصی تعجب بھی نہیں
لکھ دے گر آسامیٔ نامی بنامِ دوستاں
پھر تو شکرانہ بجا لاکر بہ درگاہِ کریم
روز و شب ان کو دعا دیتا رہوں میں جاوداں

خط

سر دفترِ اشتیاق کیشاں — شیرازۂ خاطر پریشاں
اللہ رکھے تمہیں سلامت — باعیش و نشاط تا قیامت
تا زیست نہ ہو تمہیں کوئی غم — غم کھانے کو ایک ہم ہیں کیا کم
اپنی ہے یہی دعا خدا سے — تم خوش رہو ہم موئے بلا سے
مطلوب تمہاری عافیت ہے — یاں خیر نہیں تو خیریت ہے
جس دن سے کہ تم ادھر سدھارے — راتوں کو گنا کروں ہوں تارے
انجم سے جو شب شمار غم ہے — دن کو مجھے کار و بارِ غم ہے
دن رات غرض ہوں غم کا مہماں — دنیا میں ہوں کوئی دم کا مہماں
جی نکلا ہی تن سے جائے ہے ہائے — نہ رہ یہی دل میں آئے ہے ہائے
اک بار نصیب کھو گیا کیا — کیا تھا اور آہ ہو گیا کیا
عالم کی تھی رشک اپنی اوقات — تھی صحبتِ وصل گرم دن رات
ہوتی تھی نہ صبح دوپہر بن — واقف نہ تھے نکلے ہے کدھر دن

راتوں کو تھا اپنی نیند سوتا — اُٹھتا جو سحر کو شاد ہوتا
عشرت نے مچا رکھا تھا یہ غدر — دن عید تھا رات لیلۃ القدر
اک بار سفر کی تم نے ٹھانی — کی حلق پہ سر سے تیغ رانی
یا شب مجھے صبحِ دل کش تھی — یا روندے ہے بنکے مست ہاتھی
تنہا نہ شبِ سیاہ کا غم — دن دیو سفید سے نہیں کم
مہلت کوئی دم جو فیل شب دے — یہ دیو سفید بچنے کب دے
جینے سے غرض خجل ہے مایوس — مرنے میں کوئی بھرے ہے افسوس
ہر لحظہ پیام ہے اجل کا — جانے ہے مذاق اِس غزل کا
❊
کس سے کہیں حال آہ اپنا — فرقت میں ہُوا وصال اپنا
تم جب سے چھٹے ہمیں فرشتے — دکھلانے لگے جمال اپنا
باز آئے ہم ایسی زندگی سے — جی لے یہ غدا انکال اپنا
اُمید دکھا وے آ کے صورت — ہے تم سے یہی سوال اپنا
ہے وصل محال اسکا عاصی — آسان کرے حق محال اپنا
❊
ظاہر میں نہیں کوئی ہمیں آس — پُر رحمتِ حق سے ہے کفِ یاس
قدرت جو دکھانے پر وہ آوے — دم میں تمہیں ہم سے لا ملاوے
مشکل ہے یہی کہ ہم ہیں بے صبر — کم جی اسی دکھ کو سمجھے ہیں جبر
فرقت میں جو دن یہ دس کٹے ہیں — غم میں ہمیں سو برس کٹے ہیں
کب مانو گے تم مرے کہے سے — یہ دن مجھے کم نہیں دہے[۱] سے
بس میں ہُوں کہ تعزیہ ہے دل کا — نالہ نہیں مرثیہ ہے دل کا
رگ رگ میں ہُوا ہے دخلِ ماتم — سرتا بقدم ہوں نخلِ ماتم
سوزِ تپِ غم سے ہوں بجاں میں — جلنے میں اَلم ہوں شمع ساں میں

۱؎ "دہے" محرم کے دس روز۔ یعنی ماتم

ہر صبح یمِ ستم کی ہے متوج، ہر شام ہے مجھکو شام کی فوج
ہر روز ہے کربلا کی آفات، ہر رات ہے مجھکو قتل کی رات
ہے نعرۂ ہائے دوست ہردم شوال ہُوا مجھے محرم
جاں کو زبس اکتساب غم ہے منشورِ طرب کتاب غم ہے
تسکیں کو جو تم نے خط لکھا تھا شوق اپنا جو اک نمط لکھا تھا
یاد اُس سے بڑھی مجھے تمہاری دُونی ہُوئی دل کو بے قراری
دو چار ترے حروف یکسر نشتر ہو چبھے مرے جگر پر
ہر لفظ تھا شیشۂ ہلاہل مضمون تھا بیکسوں کا قاتل
اشعار وہ خلق کے لئے تھے خنجر مرے حلق کے لئے تھے
وہ خط جسے کہئے رشکِ گلشن، آتش کو مری بنا تھا دامن،
رو رو کے پڑھا تمام میں نے دل کو لیا تھام تھام میں نے
ہر دیدۂ تر پہ اپنے رکھا، پھاہا سا جگر پہ اپنے رکھا
آنکھوں کو ہُوا جو نور حاصل تو دل کو ہُوا سرور حاصل
مجھ جیسے کو بے وفا لکھا ہے حیراں ہُوں کہ تمنے کیا لکھا ہے
اپنی سی مری بھی چاہ جانی اللہ رے تیری بدگمانی
ہم عشق میں جی کو یُوں گنوائیں تو بھی نہیں کچھ تمہارے بھائیں
ہم تم سے اگر نہ دل ملاتے کیوں ایسی مصیبتیں اُٹھاتے
وحشت سی پڑی ہے آہ وحشت سائے سے ہے اپنے مجھکو دہشت
نے کوئی انیس ہے نہ ہمدم نے راز سے اپنے کوئی محرم
سر پر جو شفیق ہے تو غم ہے غمخوار و رفیق ہے تو غم ہے
ہمدرد فقط دلِ حزیں ہے دل سوز اک آہِ آتشیں ہے
شرمندہ نہیں ہیں ہمنشیں کے ہیں دست نگر تو آستیں کے[1]

[1] اپنے آنسو اپنی آستیں سے پونچھ لیتے ہیں۔

بس ہم ہیں اور اپنے گھر کا کونا
پہروں مُنہ ڈھانپ ڈھانپ رونا
اس میرے قلق سے ہو وہ آگاہ
جس کو نہ ہو دل میں یار کی راہ
ہم کیا کریں تم سے اب شکایت
یہ غم ہے طویل اک حکایت
آنا نہ اگر عتا جی نگر[1] سے۔
کیوں کھو گئے ہمکو اپنے گھر سے

بیانِ واقع نزاع لفظی

(بحضور مرزا محمود شاہ)

مستی نشہ کا بیاں یہ ہے
حال جتنا ہے سب عیاں یہ ہے
نشہ کی دھن میں لگ رہی تھی یہ لو
نظر آتی تھی کشتِ سبزہ جو
ایک کے منہ سے یہ سخن نکلا
مرزا بابر کی دن ہے برسی کا
اُن کی ارواح کو ثواب ہوا
نشۂ مے جو با کباب ہوا
کوئی بولا کہ سچ کہی یہ بات
مے وہ پیتے تھے خوب دن اور رات
پہنچے اس کھانے کا ثواب انہیں
ہو نہ یارب کوئی عذاب انہیں
دفعتہً اس میں سب ہوئے خاموش
نشہ سے اُڑ گئے پھر اپنے ہوش
بات اتنی مرے دہن سے ہوئی
جھوٹ اس میں نہیں سرِ مُو بھی
صاحب عالم مرے سلامت ہوں
اُن کے دشمن جہاں سے غارت ہوں
منہ سے نکلی یہ لاکھ بار سدا
خوش ہوا کوئی دل میں کوئی خفا
پیر و مرشد ہے اس میں جائے غور
سنئے یہ طرفہ ماجرا ہے اور
جس سے جس کی جرا دری ہو گی
ایک کی ایک سے ہنسی ہو گی

[1] جے پور

کوئی ادنٰے ہے کوئی اعلٰے ہے   کوئی سُسرا ہے کوئی سالا ہے
کوئی عموں کوئی برادر ہے،   کوئی ہمشیر کوئی مادر ہے
کوئی خالہ ہے کوئی پھپھی ہے   کوئی بھوجائی اور کوئی دھی ہے
کوئی ہمزلف کوئی بجائی ہے   کوئی پھوپھا کوئی جنوائی ہے
رشتداری کا ہے یہ سر رشتہ   عقد تسبیح جوں ہو در رشتہ
میری تقصیر معاف ہو تو کہوں   میرا کہنا لگے ہے سب کو زبوں
راست گوئی سے اپنی ہوں لاچار   یار ہو جائیں ہیں مرے اغیار
کچھ نہیں میں کسی سے لیتا ہوں   تمکو لاکھوں دعائیں دیتا ہوں.
مقصد دل ہمارے آویں بن   دوست ہوں شاد دور ہوں دشمن
جوں ہما اپنے رکھ تہ سایہ   یہ ہے عاصی تیرا فرو مایہ
خوب جانے ہے اسکو سوہن لال[1]   کیجے دریافت ان سے سب احوال
پی کے متحمل نے خوب جام شراب   اُبھرا دریائے غم میں شکل حباب
جتنا لوگوں نے اس کو سمجھایا   اتنا اس نے دماغ کو کھایا
مجھ سے خاموش جب رہا نہ گیا   میں تو جھنجلا گئے پھر تو اس سے کہا
کچھ نہیں ہے یہ راہ سرمستی   پائی جاتی ہے صاف خرمستی
تو جو خاوند کو ہے کہتی زبوں   کیا کیا ہے کچھ اس نے تیرا خوں
ہمکو سمجھ کر لو ان کو کچھ نہ کہو   ہنسی آپس کی ہے جو ہو سو ہو
وہ تو لوگوں کا تھا ہی بہکایا   اور طعمہ حرام کا کھایا.
صاحب عالم کو لائے کیا یہ خیال   تھا وہ متصدیوں میں مالا مال
کون محمود شاہ کوئی نہیں،   مال جو کچھ ہیں سب ہمیں ہیں ہمیں
سنا یہ اس کا جب کلام درشت   ہوئی اسکی اور اپنی ہفت اور ہشت

[1] راجہ سوہن لال مشاہیر درباریں سے تھے بازار سیتارام میں ایک کوچہ اُنکے نام سے ابتک مشہور ہے

اس کو بلوا کے کیجئے معقول
ورنہ عاصی . . . . . . ل

معنی خیز کبت

معلوم ہوتا ہے، کہ ردیف تیلیاں کی غزل کے معرکہ کے بعد بہادر شاہ ظفر کی ذوق کے ساتھ غیر منصفانہ اور بے محل طرفداری کی وجہ سے عاصی ظفر اور ذوق دونوں سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ جب اکبر شاہ بادشاہ کی وفات پر بہادر شاہ تخت نشین ہوئے، تو اس کے متعلق ایک کبت تحریر کیا گیا۔ کہ

واہ جی واہ بہادر شاہ جن کے تا نا ل وزیر
کمر ٹوٹو بخشی اور نلی ٹوٹو نائب ہے
تان سین نان دھاری قطبو طفل مکتب کیئو
عاصی تیں[1] پچھڑو ذوق بنو میر نائب ہے
لنگ[2] تیں کور تک ہونی تھی سو ہولی،
نفع میں شاہ اکبر گر گیو عجائب ہے
ارے من موڑھ یہ سلطنت ہے کوڑھ
عقل اور شعور یا قلعہ ہی تیں غائب ہے

تشریح

تا نا ل وزیر:۔ مرزا لعل بیگ خاں جو اپنے آپ کو مغل سمجھتے تھے، لیکن دہلی کے شرفا ان کو جلاہا جانتے تھے۔ وزیر بن گئے۔

کمر ٹوٹو بخشی:۔ جو عہدہ بخشی گری پر مقرر ہوئے، وہ کبڑے تھے، اور خاندان بخشی مرزا احمود خاں

نلی ٹوٹو نائب:۔ مرزا شاہ رخ جس وقت ولی عہد ہوئے تو وہ لنگڑے تھے

[1] سے [2] لنگڑے سے اندھے تک

قطبو :۔ قطب بخش دوم کو خطاب تان رس خاں کا دیا گیا تھا۔
لنگ تین کورتک (لنگڑے سے اندھے) یعنی تیمور لنگ سے شاہ عالم اندھے
بادشاہ تک خاتمہ سلطنت قرار دے کر شاہ اکبر کی سلطنت نفح میں قرار دی۔

شعر

پھنسا جو آن کر عاصی قلعہ کے اِس چغر بے میں
پھرا وہ سنگ پارس ڈھونڈتا اُلّو کے ڈڑبے میں

شعر

یوں تھے تم اے ظفر شہِ اکبر کے روبرو جیسے او بابے دال مزعفر کے روبرو

مرزا لعل بیگ معہ اپنے پسر مرزا اسد بیگ و مرزا جام بیگ و اُلفت بیگ
مدار المہام قلعہ کے تھے۔ جب یہ چاروں موقوف ہو کر قلعہ سے نکالے گئے، تو
اسکی یہ تاریخ لکھی :۔

اچھالِ کر نمک حراموں خانہ دالا شاہی لُوٹا،
گودڑیں لے گئے جواہر جتنا کاغذ لکھا جھوٹا،
شیشۂ عطرِ مضامیں عاصی دستِ غیب سے جب دم چھوٹا
ہاتف بولا ذوق سے کہہ دے چاروں نکلے "انا ٹوٹا"

۱۲ م ۵۵

جی سکھ رائے قوم بقال کو بہادر شاہ نے خان ساماں کا خلعت دیا۔
ان کی گردن پر رسولی تھی۔ ان حضرت کا یہ طریقہ تھا، کہ کچھ روپیہ بادشاہ
کے ذاتی خرچ کو دے کر غریب غربا کی تنخواہیں کاٹ لیتے۔ اور وہ چند سے چند
خورد برد کر جاتے۔ جب کوئی غریب نالش کرتا، تو بادشاہ سے عرض کر دیتے،
کہ اُسی رقم جیب خاص میں یہ تنخواہ داخل ہو گئی ہے، آئندہ دی جائے گی،
حضور سے حکم ہو جاتا۔ "بر آئندہ دادہ شود"
صد ہا جھر دم رہ جانے۔

قطعۂ تاریخ فی البدیہہ

خانساماں کی خلعت کی خبر سن کر صبا — شاخ گل پر وہیں ہر بلبلِ بستاں چرغا
ہاتفِ غیب سے تاریخ جو پوچھی دل نے — یوں کہا پھیر کے یک لخت عنان یرغا
بدعائے غربا اسکی ہے گردن پہ وبال — کبھی ٹھہرا ہے نہ ٹھہریگا یہاں یہ مرغا
۱۲۵۶ھ

راجہ دیبی سنگھ و راجہ سالگ رام پسران راجہ جی سکھ رائے ذات بنیا جو سیہ فام تھے، اور بعہد بہادر شاہ بادشاہ بعہدہ مختیاری سرفراز ہوکر غریب غربا کی تنخواہ کاٹ کر ضرر رساں بنے۔ ان کی موقوفی کی تاریخ یہ ہے۔

زحل زادہ زنگی نژادانِ ہند، — سیہ رُو، سیہ کار، شکلِ پریت
رضائے قضا سے بیک بارگی — گیا بختِ خوابیدہ جب اُن کا جیت
بہ مختاریٔ میرزا شاہ رُخ — لگے آنے جانے پدر کے سمیت
ہوئی اُن سے سرزد خطائے عظیم — نہ رکھتے تھے کچھ حق پرستی سے ہیت
تو پھر اہلِ پورب یہ کہنے لگے، — ششر ہم کو تنخواہ پوری نہ دیت
ہُوا دل جو تاریخ کا خواستگار — ندا غیب سے آئی یہ بیچ کھیت

کہا ہاتفی نے زروئے قسم [۱]
قلعہ سے بدر ہو گئے۔ راہ کیت [۲]
۱۲ ھ ۵۸

---

۱ ق (زروئے قسم) = ق ۱۰۰ (قلعہ :- ق ۱۰۰ + ل ۳۰ + ع ۷۰ + ہ ۵ = ۲۰۵) سے :- س ۶۰ + ی ۱۰ (بدر :- ب ۲ + د ۴ + ر ۲۰۰ (ہو :- ہ ۵ + و ۶، گئے :- گ ۲۰ + ء ۱ + ی ۱۰ (راہ :- ر ۲۰۰ + ا ۱ + ہ ۵ (کیت :- ک ۲۰ + ی ۱۰ + ت ۴۰۰ = ۱۲۵۸ھ

۲ راہو کیتو :- یعنی دونوں بھائی۔ راہو کیتو۔ دو منحوس ستارے ہیں، جن کے زیرِ اثر سورج اور چاند کو گرہن لگتا ہے۔

تاریخ شادی حضرت بہادر شاہ ہمراہ زینت محل

ہے فصلِ گل مزا دے ہرگز نہ سیرِ گلشن — برسائے لاکھ گوہر بے وقت ابرِ بہمن
شاہ و گدا انلک ہے یہ بات سب پہ روشن — جو کام ہے جواں کا آئے نہ پیر سے بن
پوچھا جو ہاتفی سے دل نے بوقت گفتن — دی یہ ندائے غیبی بارہ سو اب ہیں چھپن ۱۲۵۶ھ
اس میں جو طرزِ نو سے دکھلائے سامری فن — اُستاد تجھکو جانے ہر شیخ اور برہمن
بکری عروس تو کا لوٹے گا کون جوبن — ہفتاد سالہ دولہا، گیارہ برس کی دولہن
دیکھا .... — تاریخ ہم برآمد، از پردۂ نشیمن

عاصی بذوق کہدے تو بھی اُٹھا کے چلمن
نکلے جہاں میں عاصی[۱] او نعم خلیفا بولن
۱۹ ھ ۵۶

تاریخ غدر دہلی سنہ ۱۸۵۷ء

پڑی جب برف کی مانند سردی ماہ کاتک میں — تو ٹھنڈا ہو گیا فوراً چراغ صدر دہلی کا
رہی تاریکیٔ عالم زمین یاس پر یاں تک — کہ گردوں پر نظر آیا نہ ہرگز بدر دہلی کا
زبانِ بے گناہی یہ نکالی گرمی دل نے — پھرا مرتا ہزاروں آدمی بے قدر دہلی کا
کہا ہاتف نے شور کار توسی پھونک پیدا کیجیو — رہیگا یاد عاصی عمر بھر تک غدر دہلی کا

قطعہ تاریخ قتل ولیم فریزر صاحب ایجنٹ دہلی

روز دوشنبہ بست و دو مارچ — دو گھڑی شب گذشتہ دریک دم
دفعتہً شور از جہاں برخاست — شدہ تاریک روز در ماتم
بے سبب از حیات بے پایاں — بست رختِ سفر بہ ملکِ عدم
بہر سال وفات رستم عہد — ناگہاں از خرد چو پرسیدم
از سرِ ظلم زو بقتل آورد — یعنی شمشیرِ کمشنر اعظم
گفت ہاتف زروئے درد و الم — آہ! خونِ فریزرِ دلیم۔ ۱۲۵۰ھ

[۱] گنہگار

وفات ولیم فریزر ایجنٹ دہلی

سی و پنج ہزار و شش صد روز دو شنبہ شہر حال
مرگِ فریزر در ۲۲ مارچ ماتمے غم شد بہ سال
سنہ ۱۲۵۰ھ
سنہ ۱۸۳۵ء
مرغے روح بہ پرواز آمد - رفت ز قلب پائے خیال
سنہ ۱۲۵۱ھ سنہ ۱۸۳۵ء
۱۰۰۲
چرخ اخضر قتل علم زد آہ بیپائے بلا امسال
۶۰۰ ۸۰۰ ۴۰۰ ۳۰ ۴ ۱ ۵
تیغ تباہی وا شدہ آخر در رہ عمر بجاہ و جدال
۱۸۳۵ ۱۸۳۵
طبع چو کرد بصنعتِ کامل فکر تجسس اے عاصی
آخر کار از جام بر آمد ، مادۂ تاریخ قتال
۲۳
سنہ ۱۸۳۵ء
۱۸۳۵
و غضب تو بلا - آخر غضب و بلا زخم آمد مادۂ تاریخ قتال،
بے سرو پا شد مثلِ آہو ، آمدہ اند بدام محال
فرحت و برکت غربت و علم و نظم و نظام و جاہ و جلال
۵
۳۰۰ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴۰ ۳۰ ۹۰۰ ۹۰۰ ۵ ۳۰
سنہ ۱۸۳۵ء سنہ ۱۸۳۵ء
قتل گشت بہ قتل ستمگر وائے دریغا وائے دریغ
۱۲۵۰ ۱۲۵۰ ۱۲۵۰
طرفہ بلائے قلبِ غم شد پیدا آہ بروز وصال
س م م چ ت ک ط ا ب ف ق ط سنہ ۱۸۳۵ء

ہر مصرع کے شروع کے حرف کے اعداد کی میزان بھی
سنہ ۱۸۳۵ء ہوتی ہے -

تاریخِ وفاتِ ذوق

لوگوں نے اُٹھا جنازۂ ذوق لا زیرِ قدم[1] شریف رکھا
عاصی ہوئی برکتِ قدم سے تاریخِ وفاتِ ذوق از پا
۱۲۷۱ھ

تاریخِ گرفتاریٔ مرزا غالب

مرزا نوشہ شاعرِ بے بدل دہلی رندِ مشرب المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوالِ دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی۔ اور اس نے بعلّتِ قمار بازی اُن کو قید کرا دیا۔ جس کی سنہ ذیل تاریخ لگائی گئی:-

سرِ ابجد سے فصلی[2] میں تو سب اظہارِ طوفاں ہے
۱۲ ھ ۵۷
۱۸۴۷ء
اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قیدِ غریباں ہے
۱۲ ھ ۶۳
قلق غالب نہ کیونکر موش اور گربہ کے دل پر ہو
۱۲ ھ ۶۳
دبی بلّی کٹاتی کان چوہوں سے بہ زنداں ہے۔
رہائی روزِ بد سے میرزا نوشہ کی کیونکر ہو،
زنِ غمخوار بن کر واں گیا فیض الحسن خاں ہے۔
۱۹۰۴ بکرمی
سرِ بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصی!
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بزنداں ہے۔

---

[1] نام مزار حضرت قطب الدین بختیار کاکی
[2] ایک سمت کا نام۔

بروقت گرفتاری کو توال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقعہ پر گئے۔ اور ظاہر کیا، کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے۔ اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں، کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینہ کے اندر بہت جمعیت تھی۔ اور کچھ امدادی برقنداز پہنچ گئے، گرفتار کر کے قید کرادیا۔ بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے۔ اور عدالت میں برارت کے ساعی ہوئے۔ مگر قید ہو ہی گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیاں جیلخانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے۔ اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا۔ ؎

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیہ کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اُس وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھکر رہا کرادیا۔

تاریخ وفات

پنڈت نرائن داس صاحب ضمیر (جد علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی)

شاعرِ غرا، ناثرِ یکتا، ہندسہ داں، لائقِ تحریر
چرخ بھی گر سو چکر کھائے، پائے نہ ایسا خوش تقریر
عاصی نے تاریخِ رحلت، ہاتف سے دریافت جو کی
بولا از سرو پائے تباہی، ہائے نرائن داس ضمیر
۱۸ ۶ ۵۱

ختم شد